دسمبر ۱۹۹۰ء

ماہنامہ حکمتِ قرآن لاہور

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

حرفِ اوّل	عاکف سعید	۲
الفرقان (نشری تقریر)	ڈاکٹر اسرار احمد	۳
ہدایت القرآن (۴۵)	مولانا محمد تقی امینی	۶
منشورِ اسلام (۱۶)	ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم	۱۳
حکمتِ اقبال (۲۸)	ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم	۲۵
نقطۂ نظر (نظامِ اسلام کیا ہے؟)	سلیم بہادر ملکانوی	۳۱
لغات و اعرابِ قرآن (۱۹)	پروفیسر حافظ احمد یار	۴۳
تعارف و تبصرہ (الرحیق المختوم)	ادارہ	۶۱
خطوط و نکات	کفایت بخاری	۶۳

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۵۶-۱۹۵۷ء میں جماعتِ اسلامی میں پالیسی اور نظمِ جماعت کے بارے میں جو شدید اختلاف رونما ہوا تھا، جس کے نتیجے میں ڈاکٹر اسرار احمد سمیت بہت سے عام ارکان اور مولانا عبدالجبّار غازیؒ، مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا عبدالغفار حسن اور شیخ سلطان احمد ایسے اکابر سمیت جماعت کی قیادت کی پوری صفِ دوم جماعت سے علیحدہ ہوگئی تھی، اس کے

حقائق و واقعات

پر مشتمل **ڈاکٹر اسرار احمد** کی اہم تالیف

تاریخ جماعتِ اسلامی

کا ایک گمشدہ باب

شائع ہوگئی ہے۔ بڑے سائز کے ۳۲۸ صفحات سفید کاغذ مضبوط لیمینٹڈ جلد، قیمت -/۸۰

(نوٹ: وی پی صرف محصول ڈاک کے ٹکٹ مالیتی -/۱۰ وصول ہونے پر کی جائیگی)

ملنے کا پتہ: **تنظیمِ اسلامی** ۶۷۔ اے علامہ اقبال روڈ

مرکزی دفتر گڑھی شاہو۔ لاہور

وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا

(البقرة: ٢٦٩)

ماهنامه

حکمتِ قرآن

لاهور

جاری کردہ: ڈاکٹر محمد رفیع الدین ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ، مرحوم

مدیر اعزازی: ڈاکٹر اسرار احمد ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی

معاون مدیر: حافظ عاکف سعید، ایم اے (فلسفہ)

ادارۂ تحریر

پروفیسر حافظ احمد یار، پروفیسر حافظ محمد فاضل، حافظ خالد محمود خضر

جلد ۹ | دسمبر ۱۹۹۰ء جمادی الاولیٰ ۱۴۱۱ھ | شمارہ ۱۲

یکے از مطبوعات

مرکزی انجمن خدام القرآن لاهور

۳۶۔ کے۔ ماڈل ٹاؤن۔ لاهور فون: ۸۵۶۰۰۳

کراچی آفس: داؤد منزل متصل شاہ بخاری، شاہراہ لیاقت کراچی فون: ۲۱۶۵۸۶

سالانہ زر تعاون: ۴۰ روپے فی شمارہ: ۴ روپے

مطبع: آفتاب عالم پریس، ہسپتال روڈ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ اوّل

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے اہم تعلیمی منصوبے 'قرآن کالج' میں تعلیم کی رفتار اور نئے داخلوں سے متعلق ضروری اطلاعات کی قارئین تک بہم رسانی کے لیے وقتاً فوقتاً اِن سطور کو ذریعہ بنایا جاتا ہے۔ اِس ماہ بھی اس ضمن میں ہمیں ایک اہم اطلاع قارئین تک پہنچانی ہے۔

قرآن کالج میں ایف اے کلاس کا آغاز جیسا کہ قارئین کے علم میں ہے، ۱۹۸۹ء میں کیا گیا تھا۔ پیشِ نظر یہ تھا کہ میٹرک پاس طلبہ کو کُل چار سالوں میں نہ صرف یہ کہ گریجویشن کرا دی جائے بلکہ ساتھ ہی ساتھ دینی تعلیم کا ایک معیّن نصاب بھی مکمل کرا دیا جائے۔ دینی تعلیم کی تدریس کے لیے ہم اُس اضافی وقت کو اپنے کام میں لانا چاہتے تھے جو عام کالجوں میں کئی کئی ماہ کی مسلسل چھٹیوں اور بے قاعدہ پڑھائی کے سبب سے ضائع ہو جاتا ہے ــــ ہمیں اپنی اس اسکیم میں گو ابھی تک مطلوبہ درجے کی کامیابی حاصل نہیں ہوئی ہے تاہم اس معاملے میں ہم نااُمید بھی نہیں ہیں۔ اللہ کا شکر و احسان ہے کہ ہماری کوششیں بتدریج بارآور ہو رہی ہیں ــــ ابھی حال ہی میں انٹرمیڈیٹ بورڈ کے ایک فیصلے کے باعث ہمیں ایک نئی اور پیچیدہ صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ بورڈ نے فیصلہ کیا ہے کہ فرسٹ ایئر اور سیکنڈ ایئر کا یکجا دوسرے سال امتحان لینے کے بجائے بورڈ ہر سال فرسٹ ایئر اور سیکنڈ ایئر کا الگ الگ امتحان لے گا۔ یہ نیا فیصلہ اگرچہ بعض اعتبارات سے خوش آئند ہے لیکن قرآن کالج کی تعلیمی پالیسی کے ساتھ کچھ زیادہ موافقت نہیں رکھتا۔ اس صورتِ حال سے عہدہ برآ ہونے کے لیے قرآن کالج کی انتظامیہ نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ سال فرسٹ ایئر میں داخلوں کے لیے میٹرک کے رزلٹ کے نکلنے کا انتظار نہیں کیا جائے گا بلکہ میٹرک کے امتحانات کے اختتام پر ہی قرآن کالج میں طلبہ کو فرسٹ ایئر میں داخلہ دے دیا جائے گا۔ داخلوں کے لیے معیّن تاریخ کا اعلان تو آئندہ اشاعت ہی میں کیا جا سکے گا، تاہم رفقاء و احباب سے گزارش ہے کہ وہ مذکورہ بالا امور کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ابھی سے فرسٹ ایئر کے داخلوں کے لیے طلبہ کو ذہنًا تیار کرنے کی تگ و دو شروع کر دیں۔ اس معاملے میں ہم اپنے احباب کے تعاون کی شدید ضرورت محسوس کرتے ہیں!

نشری تقریر

ڈاکٹر اسرار احمد

قرآن کا دُوسرا اہم نام

'الفُرقَان'

قرآن اللہ کا کلام ہے اور یہ ایک مسلّمہ اصُول ہے کہ کلام میں متکلّم کی جُملہ صفات کا عکس موجود ہوتا ہے۔ بقول علاّمہ اقبال مرحوم ؎

مثلِ حق پنہاں وہم پیداست اُو　　　زندہ و پائندہ و گویاست اُو

یعنی ذاتِ حق تبارک کی طرح اس کا کلام یعنی قرآن مجید بھی ظاہر بھی ہے اور مخفی بھی، اور زندہ و پائندہ بھی ہے اور گویا و متکلّم بھی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ اور قرآن حکیم کے ناموں کے بارے میں بھی بعینہٖ یہی صورت پائی جاتی ہے کہ جس طرح اللہ کے ناموں کا ویسے تو احاطہ ممکن ہی نہیں ہے، اس لیے کہ از روئے قرآن تمام اچھے نام اللہ ہی کے ہیں۔ (قُلِ ادۡعُوا اللّٰہَ اَوِادۡعُوا الرَّحۡمٰنَ ؕ اَیًّامَّا تَدۡعُوۡا فَلَہُ الۡاَسۡمَآءُ الۡحُسۡنٰی۔ بنی اسرائیل : ۱۱۰) تاہم قرآن و حدیث میں جو ننانوے ۹۹ نام اللہ کے وارد ہوتے ہیں وہ سب کے سب بالاتّفاق صفاتی ہیں، سوائے ایک نام یعنی 'اللہ' کے، جس کے بارے میں دو رائیں پائی جاتی ہیں، یعنی یہ کہ بعض حضرات کے نزدیک یہ بھی صفاتی نام ہے جو 'اِلٰہ' پر لامِ تعریف داخل کرنے سے بنا ہے۔ جب کہ بعض محقّقین کے نزدیک یہ اسمِ جامد ہے اور خالقِ ارض و سماء کا اسمِ ذات یعنی "عَلَم" ہے ——— بالکل اسی طرح قرآن مجید کے نام بھی بعض علماء نے تو نوّے ۹۰ تک گنوا دیئے ہیں، جبکہ ثقہ علماء مثلاً علاّمہ ابوالمعالی ؒ نے پچپن ۵۵ گنوائے ہیں، اور یہ سب کے سب صفاتی نام ہیں، جن میں سے چھ نہایت اہم اور اساسی نوعیت کے حامل ہیں۔ یعنی 'القرآن' 'الفرقان'، 'الذّکر'، 'الھُدٰی'، 'الکتٰب' 'التّنزیل'۔ اور ان میں سے بھی ایک نام تو وہ ہے جو تقریباً اسمِ عَلَم کے درجے کو پہنچ گیا ہے یعنی 'القرآن' ——— چنانچہ خود اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام میں کم از کم اِکسٹھ بار اسے اسی نام سے موسوم کیا ہے۔

باقی ناموں میں ہر اعتبار سے اہم ترین اور موزوں ترین نام الفرقان ہے۔

فرقان فرق سے بنا ہے جس کے معنی ہیں دو یا دو سے زائد چیزوں کو اس طرح جدا جدا کر دینا کہ وہ بالکل ممیز ہو جائیں اور ان کے مابین کسی گھپلے کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔ فرقان فُعلان کے وزن پر مبالغے کا صیغہ ہے یعنی حق و باطل اور صحیح و غلط کے مابین فرق و امتیاز کے اعتبار سے آخری حد کو پہنچی ہوئی چیز۔ یہ ایک باطنی وصف اور وہبی ملکہ بھی ہو سکتا ہے، یعنی یہ کہ کسی شخص میں اللہ تعالیٰ حق و باطل کے مابین تمیز کرنے کی استعداد کو انتہائی درجے تک پہنچا دے۔ جیسے سورۃ الانفال میں فرمایا: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَتَّقُوا اللَّهَ يَجْعَل لَّكُمْ فُرْقَانًا (یعنی اے اہلِ ایمان اگر تم اللہ کا تقویٰ اختیار کرو گے تو اللہ تمہارے اندر وہ باطنی بصیرت پیدا فرما دے گا جس سے تم کھرے اور کھوٹے کے مابین پوری[1] تمیز کر سکو گے!) اسی طرح کوئی واقعہ بھی اس کیفیت کا حامل ہو سکتا ہے کہ اُسے الفرقان قرار دیا جائے، جیسے کہ غزوۂ بدر جس میں احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کی کیفیت انتہائی شدت کو پہنچ گئی تھی۔ چنانچہ قرآنِ حکیم نے یوم بدر کو یوم الفرقان قرار دیا۔

قرآنِ مجید کتبِ سابقہ کی عظمت کے بیان میں بھی ہرگز بخل سے کام نہیں لیتا۔ چنانچہ اس نے دو مقامات پر تورات کو بھی الفرقان قرار دیا ہے۔ جیسے سورۃ البقرۃ میں فرمایا: وَإِذْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ (اور یاد کرو جب ہم نے عطا فرمائی موسیٰؑ کو کتاب اور فرقان تاکہ تم ہدایت پاؤ) یا جیسے سورۂ انبیاء میں فرمایا: وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى وَهَارُونَ الْفُرْقَانَ وَضِيَاءً وَذِكْرًا لِّلْمُتَّقِينَ (اور ہم نے موسیٰ اور ہارون کو عطا فرمائی فرقان اور روشنی اور اہلِ تقویٰ کے لیے یاددہانی!) یہ اس لیے کہ اپنے دور کے ظروف و احوال اور اپنے زمانۂ نزول میں انسانی فہم و شعور کی سطح کے اعتبار سے یقیناً تورات بھی حق و باطل میں تمیز کے ضمن میں فیصلہ کن تھی۔ البتہ یہ نکتہ غور طلب ہے کہ ان دونوں مقامات پر الفرقان کا لفظ اس طور سے آیا ہے کہ اس کی مراد واحد لازماً تورات نہیں ہے۔ بلکہ یہ امکان موجود ہے کہ اس لفظ کا مصداق وہ معجزات ہوں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دیئے گئے۔ لیکن کلامِ الٰہی میں خود قرآن مجید کے لیے یہ لفظ اس شان کے ساتھ وارد ہوا ہے کہ اس کے مصداق کے بارے میں دو رایوں کا کوئی امکان ہی نہیں ہے

---

[1] حضرت عمرؓ کو اللہ تعالیٰ نے یہ باطنی وصف ودیعت فرمایا تھا اور اسی باطنی وصف کی وجہ سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ کو فاروق کا خطاب عنایت فرمایا تھا۔

اور اس سے مراد قطعی اور متعیّن طور پر صرف اور صرف قرآن مجید ہے۔ چنانچہ اس سورۂ مبارکہ کا آغاز جو خود اسی نام یعنی الفرقان سے موسوم ہوئی' ان پُرشکوہ الفاظ سے ہوتا ہے: تَبَارَكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَىٰ عَبْدِهِ لِيَكُونَ لِلْعَالَمِينَ نَذِيرًا ط (یعنی بڑی ہی بابرکت ہستی ہے جس نے اپنے بندے (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر الفرقان نازل فرمایا تاکہ وہ تمام جہانوں کے لیے خبردار کرنے والا بن جائے۔) ظاہر ہے کہ یہاں الفرقان کا لفظ متعیّن طور پر قرآن مجید کے لیے آیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حق و باطل کے درمیان فرق و امتیاز کا وصف قرآنِ حکیم میں اپنے نقطۂ عروج یعنی Climax پر پہنچ گیا ہے' بایں طور کہ وہ مجسّم الفرقان بن گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کے نزول کا ذکر اس قدر پُرشکوہ انداز میں ہوا کہ بہت ہی بابرکت ہے وہ ذات جس نے اسے نازل فرمایا۔ اور اس کا عبدِ کامل ہے وہ جس پر وہ نازل ہوا۔ گویا ایک طرف اُس ذاتِ ستودہ صفات کی برکات کا ظہور بھی اس کتابِ حکیم کے نزول کے ضمن میں انتہائی شدّت کو پہنچ چکا ہے' جس نے اسے نازل فرمایا۔ اور دوسری طرف عبدیّتِ کاملہ کا ظہور بھی اس مقدّس ہستی کی صورت میں سامنے آگیا ہے جس پر یہ نازل کیا گیا' یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم' جنہیں سورۂ بنی اسرائیل اور سورۃ الکہف کی ابتدائی آیات کی طرح اس سورۂ مبارکہ کی اس پہلی آیت میں بھی عَبْدُهٗ قرار دیا گیا' یعنی اللہ کی عبدیّتِ کاملہ کا مظہرِ اتم و اکمل۔ اگرچہ ہم اُن کی عبدیّت کو اپنی عبدیّت پر قیاس نہیں کر سکتے بقول علامہ اقبال ؎

عبد دیگر' عبدہٗ چیزے دگر ما سراپا انتظار' اُو منتظر!

اِن تینوں کمالات یعنی اللہ کی برکات کے کمال کا ظہور بہ شکلِ نزولِ قرآن' کلامِ الٰہی کی صفتِ فرقانیّت کا ظہورِ کامل بصورتِ الفرقان اور عبادتِ الٰہی کے نقطۂ عروج کا اظہار بصورتِ شخصیّتِ محمّدی صلی اللہ علیہ وسلم کا منطقی نتیجہ ہے کہ: رَسُولٌ مِّنَ اللَّهِ يَتْلُو صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ۝ فِيهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ۝ (البیّنۃ) کے مصداق اب یہ رسولِ کامل و اکمل' فرقانِ کامل یعنی قرآن مجید کے ساتھ تمام جہانوں یا جہان کی تمام اقوام و ملل اور تا قیامِ قیامت جملہ ادوار و زمن کے لیے امام و ہادی' داعی و مبلّغ' شاہد و شہید' مربّی و مزکّی اور فی الجملہ تمام دُنیوی و اُخروی خطرات اور خدشات سے خبردار کرنے والے بن گئے ہیں۔

فَصَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَعَلَىٰ آلِهِ وَأَصْحَابِهِ وَسَلَّمَ كَثِيرًا كَثِيرًا ۝

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝

سورۃ البقرۃ: آیات ۲۴۳ تا ۲۵۲

قوموں کی موت وحیات کے بعض اہم مسائل

اوپر شادی بیاہ (معاشرتی زندگی) سے متعلق بعض اہم احکام بیان ہوئے تھے، اب قوموں کی موت وحیات سے متعلق بعض اہم مسائل بیان کیے جارہے ہیں۔ ثبوت میں تاریخی شہادتیں پیش کی گئی ہیں جن میں قوموں کی موت وحیات سے متعلق بڑی گہری حقیقتوں کی نشان دہی کی گئی ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا
مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ
مُوْتُوْا ثُمَّ اَحْيَاهُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ
وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿٢٤٣﴾ وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ
اللّٰهِ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿٢٤٤﴾ مَنْ ذَا الَّذِيْ
يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗٓ اَضْعَافًا
كَثِيْرَةً ۭ وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَيَبْصُۜطُ ۠ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿٢٤٥﴾

"کیا آپ نے ان کی حالت پر غور نہیں کیا جو ہزاروں کی تعداد میں، موت کے ڈر سے، اپنے گھروں سے نکل کھڑے ہوئے۔ اللہ نے ان سے فرمایا: "تم مرجاؤ" پھر اللہ نے ان کو زندہ کر دیا۔ بیشک اللہ لوگوں پر فضل والا ہے، لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے ہیں[1]۔ اور اللہ کی راہ میں لڑو (موت سے نہ ڈرو) اور جان لو کہ بے شک اللہ سننے والا جاننے والا ہے[2]۔ کون شخص ہے جو اللہ (سے معاملہ کرے اور اس) کو اچھا قرض دے، پھر اللہ اس کو کئی گنا بڑھا دے۔ اور اللہ ہی تنگی کرتا ہے اور کشادگی کرتا ہے۔ اور تم سب اس کی طرف لوٹائے جاؤ گے"[3]۔

۱ آیت میں بنی اسرائیل کا واقعہ ہے۔ جیسا کہ اگلی آیتوں "الم تر الی الملأ" الخ میں بنی اسرائیل کا واقعہ ہے۔ یہ دو مختلف حالات کو بیان کیا گیا ہے۔ ایک میں خوف و ذلت کی موت کا ذکر ہے اور دوسری میں موت سے زندگی کی طرف آنے کا ذکر ہے۔ درمیان میں اس کے اصول بیان کر دیئے گئے ہیں۔ آیت میں اس وقت کی حالت کا ذکر ہے جب فلسطینیوں سے جہاد اور ان سے مقابلہ کرنے کے بجائے بنی اسرائیل گھر بار چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ پھر ان پر خوف و ذلت کی ایسی موت طاری ہوئی کہ عرصہ تک اس سے نکلنے کی نوبت نہ آئی۔ حضرت شموئیل علیہ السلام کی جدّ و جہد سے خوف و ذلت کی موت سے نکلے اور ایمانی و اخلاقی زندگی کی طرف آئے، جیسا کہ آگے آرہا ہے۔ بتانا یہ ہے کہ جو قوم موت سے ڈرتی ہے اور جان و مال کو قربان نہیں کرتی ہے وہ عزّت و سربلندی کی زندگی نہیں حاصل کر سکتی ہے۔ موت اللہ کے اختیار میں ہے، بھاگنے سے نجات نہیں ملتی ہے۔

۲ موت سے زندگی کی طرف آنے کے لیے جنگ و قتال کی بھی نوبت آئے گی۔ اس میں موت سے نڈر ہو کر بھرپور حصہ لو۔ مقصد حق کی سربلندی اور اللہ کی بات کو غالب کرنا ہو، ذاتی اغراض و خواہشات پوری کرنا یا ذاتی وقار و اقتدار حاصل کرنا نہ ہو۔

۳ موت سے زندگی کی طرف آنے کے لیے مال کی محبت دل سے نکالنی ہوگی۔ جان کی قربانی کے ساتھ مال کی قربانی لازمی ہے۔ یہ چونکہ خالص اللہ کے لیے ہوگی، اس لیے اس کا اجر و انعام بھی اللہ کی نسبت سے کئی گنا ہوگا۔ "قرضِ حسن" اس کو کہتے ہیں جو خالص اللہ کے لیے ہو اور جس کی ادائیگی ضروری ہو۔

قوموں کو عزّت و اقتدار کی زندگی حاصل کرنے کے سلسلہ میں جان و مال کی قربانی نہ دینے سے ذلّت و خواری کی کیسی موت آتی ہے، اس کا اندازہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی اس حدیث سے بھی ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا:

"ایک ایسا دور آئے گا کہ دنیا کی دوسری قومیں مسلمانوں پر ایسے ہی ٹوٹ پڑیں گی جیسے کھانے کے برتن میں "نوالہ" کے لیے بھوکوں کے ہاتھ پڑتے ہیں۔ صحابہ کرام رضؓ نے سوال کیا: اے اللہ کے رسولؐ کیا ہم لوگ اس وقت تعداد میں تھوڑے ہوں گے؟

آپؐ نے فرمایا: نہیں، بلکہ تم لوگ زیادہ ہوگے لیکن "جھاگ" کی طرح بے وزن ہو جاؤ گے۔ صحابہؓ نے پوچھا: ہماری یہ حالت کیوں کر ہو جائے گی؟ آپؐ نے فرمایا: تم میں ایک بیماری پیدا ہو جائے گی جس کا نام "وھن" ہے۔ سوال کیا گیا "وما الوھن"۔ وہن کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: حبّ الدّنیا وکراھیۃ الموت (مشکوٰۃ باب تغیّر الناس) دنیا کی محبّت اور موت سے ناگواری!"

یعنی مال و دولت کی محبّت سے ہمّت و قربانی کے کام نہ ہو پائیں گے اور موت کی ناگواری سے حق کی راہ میں جان کی بازی نہ لگ سکے گی۔ جس قوم میں یہ دونوں برائیاں پیدا ہو جائیں وہ ذلّت و خوف کی موت مر جاتی ہے اور پھر وہ ہر ایک کی "لقمۂ تر" بنتی رہتی ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى
اِذْ قَالُوْا لِنَبِيٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ
قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا قَالُوْا وَمَا
لَنَآ اَلَّا نُقَاتِلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَاَبْنَآئِنَا فَلَمَّا
كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۴۶﴾
وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا قَالُوْٓا
اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ
يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ
بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ
وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۴۷﴾ وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖٓ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ
فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ هٰرُوْنَ
تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۴۸﴾
فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ فَمَنْ
شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّيْ وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّيْٓ اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ

غُرْفَةًۢ بِيَدِهٖ ۚ فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ۭ فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَالَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۙ قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ ۭ قَالَ
الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً
كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿٢٤٩﴾ وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَ
جُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا
عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٢٥٠﴾ فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۣ وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ
وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَاۗءُ ۭ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ
بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ ۙ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَي الْعٰلَمِيْنَ ﴿٢٥١﴾
تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۭ وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿٢٥٢﴾

"کیا آپ نے موسیٰ علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل کے سرداروں کی حالت پر غور نہیں کیا، جب انہوں نے اپنے نبیؑ سے کہا کہ ہمارے لیے ایک حکمران مقرر کر دیجیے، تاکہ ہم اللہ کی راہ میں جنگ کریں۔ نبیؑ نے کہا کہ تم سے کچھ بعید نہیں ہے کہ اگر تمہیں جنگ کا حکم ہو تو تم جنگ نہ کرو۔ انہوں نے کہا کہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ جبکہ ہم اپنے گھروں سے نکالے گئے اور اپنی اولاد سے جدا کیے گئے۔ پھر جب انہیں جنگ کا حکم ہوا تو چند آدمیوں کے علاوہ سب نے پیٹھ دکھا دی۔ اور اللہ فریبیوں کو خوب جانتا ہے۴؎ اور ان کے نبیؑ نے ان سے کہا کہ بلاشبہ اللہ نے طالوت کو تمہارا حکمران مقرر کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس کی حکمرانی ہم پر کیوں کر ہو گی، اس سے زیادہ تو ہم سلطنت کے مستحق ہیں اور مال میں بھی اس کو کشادگی نہیں دی گئی ہے۔ نبیؑ نے کہا کہ بلاشبہ اللہ نے اس کو تم میں سے منتخب کیا ہے اور اس کو علم میں اور جسمانی طاقت میں زیادتی عطا کی ہے اور اللہ اپنے ملک (کی حکمرانی) جس کو چاہتا ہے عطا کرتا ہے، وہ وسعت والا اور جاننے والا ہے۵؎ اور بنی اسرائیل سے ان کے نبیؑ نے کہا کہ طالوت کی حکمرانی کی یہ نشانی ہے کہ تمہارے پاس وہ صندوق واپس آئے گا جس میں تمہارے پروردگار کی طرف سے اطمینان و سکون ہے اور وہ باقی چیزیں بھی ہیں جن کو موسیٰؑ و ہارونؑ کے گھرانے کے لوگ چھوڑ گئے تھے۔ اس صندوق کو فرشتے اٹھا کر لائیں،

گے۔ بلاشبہ اس میں تمہارے لیے بڑی نشانی ہے اگر تم ایمان والے ہو[۵] پھر (کچھ دنوں کے بعد) جب طالوت فوجیں لے کر نکلے تو کہا کہ اللہ ضرور ایک "نہر" سے تمہاری آزمائش کرے گا۔ جس نے اس نہر کا پانی پیا وہ میرا نہیں ہے اور جس نے اس کا پانی نہیں چکھا وہ یقیناً میرا ہے۔ البتہ کوئی اپنے ہاتھ سے ایک "چلو" بھر لے تو وہ معاف ہے۔ ان میں سے سوائے چند آدمیوں کے سب نے اس کا پانی پی لیا (اس طرح صبر و اطاعت میں ناکام رہے)۔ پھر جب طالوت اور جو اس کے ساتھ (لشکر) تھے نہر سے پار ہوئے تو کہنے لگے کہ ہمیں جالوت اور اس کے لشکر سے جنگ کرنے کی طاقت نہیں ہے۔ البتہ جن لوگوں کو یقین تھا کہ انہیں اللہ سے ملنا ہے (انہوں نے ہمت نہیں ہاری) وہ کہنے لگے کہ بہت سی چھوٹی جماعتیں بڑی جماعتوں پر اللہ کے حکم سے غالب ہوتی رہی ہیں اور اللہ صبر و برداشت والوں کے ساتھ ہے[۶] اور جب جالوت اور اس کی فوجوں سے مقابلہ ہوا تو انہوں نے دعا کی کہ اے ہمارے پروردگار ہمارے دلوں میں صبر ڈال دیجئے اور ہمارے پاؤں جمائے رکھیئے اور اس کافر قوم کے مقابلہ میں ہماری مدد کیجئے۔ پھر اللہ کے حکم سے ان لوگوں نے جالوت کے لشکر کو شکست دی اور داؤدؑ نے جالوت کو مار ڈالا۔ اور داؤد کو اللہ نے حکمت (نبوت) اور سلطنت سے نوازا اور اللہ نے جو چاہا وہ اس کو سکھایا۔ اگر اللہ ایک گروہ کو دوسرے گروہ کے ذریعہ دفع نہ کرتا رہتا تو دنیا فساد سے بھر جاتی[۷] لیکن اللہ دنیا والوں پر بڑا فضل والا ہے۔ یہ اللہ کی آیتیں ہیں جن کو ہم ٹھیک ٹھیک آپ کو سناتے ہیں اور بیشک آپ ہمارے رسولوں میں ہیں[۸]

---

[۵] یہ قوم کی اس حالت کا ذکر ہے جب وہ خوف و ذلت کی موت سے نکل کر زندگی کی طرف آتی ہے اور عزت و اقتدار حاصل کرنے کی اس کو فکر ہوتی ہے۔ قوم میں زندگی کے آثار نمایاں ہونے کے باوجود صبر و برداشت اور اطاعت و فرمانبرداری کی صفتیں بڑی دیر میں اور مشکل سے پیدا ہوتی ہیں جن کے بغیر کسی چھوٹی بڑی مہم میں کامیابی نہیں ہوتی ہے۔ بنی اسرائیل سے حضرت شموئیل علیہ السلام کا یہ فرمانا کہ جہاد کا حکم آنے کے بعد" کچھ بعید نہیں کہ تم بیٹھ دکھا دو" انہی دونوں کی کمی کی

وجہ سے تھا۔ چنانچہ صبر کی آزمائش نہر کے پانی سے کی گئی اور اطاعت کی آزمائش حکمران کے تقرر میں ہوئی۔ آزمائش میں ان دونوں صفتوں کی کمی نظر آئی۔

۵۔ حکمرانی کی صلاحیت کے لیے علم اور طاقت کی ضرورت ہے جو طالوت میں موجود ہیں۔ مال و دولت اور نسل خاندان سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ پھر یہ انتخاب اللہ کی طرف سے ہوا ہے۔ اس کا کوئی کام دیکھے بھالے بغیر نہیں ہوتا ہے۔ اس کے پوشیدہ قوانین جن تک ہماری رسائی نہیں ہوتی ہے ان کو وہ اپنے فضل اور اپنی مشیت کا نام دیتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اس کے کام اور فیصلے تاریکی میں ہوں۔

۶۔ بنی اسرائیل کے یہاں ایک صندوق تھا جس میں تورات اور خاندانِ نبوت کے تبرکات محفوظ تھے۔ وہ اس کو بڑی عزت و احترام سے دیکھتے تھے، اس سے اطمینان و سکون حاصل کرتے تھے، اور ہر مہم میں اس کو آگے رکھتے تھے۔ "فلسطینی" حملہ کے وقت اس کو اٹھالے گئے تھے۔ اس وقت سے بنی اسرائیل محرومی و مایوسی کا شکار تھے۔ ادھر فلسطینی بھی اس کو لے جانے کے بعد مصائب و مشکلات سے دوچار ہو گئے تھے۔ بالآخر نجومیوں کے مشورے سے انہوں نے فیصلہ کیا کہ گاڑی میں رکھ کر گاڑی کو اس سمت میں ہانک دیا جائے، جس میں بنی اسرائیل کی بستیاں ہیں۔ چنانچہ گاڑی کسی محافظ و گاڑی بان کے بغیر اپنے ٹھکانے پر پہنچ گئی۔ اس طرح بحفاظت تمام ٹھکانے پر پہنچ جانا غیبی مدد کے بغیر نہیں ہو سکتا ہے۔ اسی غیبی مدد کو آیت میں کہا گیا ہے کہ فرشتے اس کو اٹھا کر لائیں گے۔ اسی طرح اس قسم کی غیبی مدد عام حالت میں نہیں ہوتی بلکہ خاص حالت میں ہوتی ہے۔ اس بنا پر غیبی مدد کو حکمرانی کے لیے طالوت کے صحیح انتخاب کی نشانی قرار دیا گیا ہے کہ پہلے یہ نشانی نہیں ظاہر ہوئی انتخاب کے بعد ظاہر ہوئی۔

۷۔ صبر و برداشت اور اطاعت و فرمانبرداری کی آزمائش میں کامیاب ہونے والے اگرچہ تھوڑے تھے لیکن بڑے مضبوط تھے۔ انہوں نے جہاد کیا اور فتح حاصل کی۔

اس موقع پر انہوں نے دو نہایت اہم باتیں کہی ہیں:

(۱) فتح و شکست کا مدار فوج کی کثرت پر نہیں ہوتا بلکہ دل میں ایمان و اخلاق کی طاقت پر ہوتا ہے

كَمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ۔

(۲) اللہ کی مدد ان لوگوں کے ساتھ ہوتی ہے جو جھیل جانے والے (صابر) ہیں۔ آزمائش میں ناکام ہونے والوں کے ساتھ نہیں ہوتی ہے۔ وَاللّٰہُ مَعَ الصَّابِرِیْنَ ٥

ؔشہ یہ اللہ کا قانون بیان ہُوا ہے کہ جب کوئی گروہ ظلم و فساد میں آگے بڑھ جاتا ہے تو اللہ دوسرے گروہ کے ذریعہ اس کو میدان سے ہٹاتا رہتا ہے۔ اگر ایسا نہ کرتا تو دنیا سے امن و امان ختم ہو جاتا اور زمین خونریزی و غارتگری سے بھر جاتی۔ اس لحاظ سے جنگ جہاد کی اجازت بھی دنیا والوں پر اللہ کا فضل ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ دنیا انسانوں کے رہنے کے قابل ہے۔

طالبانِ علمِ دین کے لیے ایک وقیع تحفہ!

امام حمید الدین فراہیؒ کی دو معرکۃ الآراء تصانیف :

(۱) اقسام القرآن

(عمدہ دبیز کاغذ، بڑے سائز ($\frac{22 \times 29}{8}$) کے ۷۴ صفحات)

(۲) ذبیح کون ہے؟

(عمدہ دبیز کاغذ، بڑے سائز کے ۸۸ صفحات)

ہمارے مکتبے میں محدود تعداد میں دستیاب ہیں۔

اِن موضوعات سے دلچسپی رکھنے والے علم دوست حضرات

دونوں رسائل **بلاقیمت**، صرف ڈاک خرچ بھیج کر

ہمارے ادارے سے حاصل کر سکتے ہیں

(نوٹ: بذریعہ بک پوسٹ رسائل منگوانے پر -/۳ روپے اور رجسٹرڈ بک پوسٹ کی صورت میں -/۹ روپے کے ڈاک ٹکٹ روانہ کیجئے۔)

ملنے کا پتہ: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن، ۳۶۔کے، ماڈل ٹاؤن لاہور۔ ۵۴۷۰۰

مؤلف: ڈاکٹر محمد رفیع الدین
مترجم: ڈاکٹر ابصار احمد

منشورِ اسلام (۱۶)

اسلام کی مطابقت پذیری (اجتہاد)

جب کسی نظریۂ حیات کی صورت یہ ہو کہ وہ ایک متعین نصب العین سے آغاز کر کے حیاتِ انسانی کے تمام گوشوں مثلاً سیاست، معیشت، قانون، جنگ و صلح وغیرہ کا احاطہ کر سکے تو خود اس کی بقاء کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوتا۔ یہ صورت بدرجۂ اتم اسلام میں پائی جاتی ہے۔ اگرچہ بادی النظر میں کبھی کبھی یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ اسلام حیاتِ دنیوی کے بعض پہلوؤں کے ضمن میں تفصیلی احکامات نہیں دیتا، لیکن اس کے باوجود تاریخی حقیقت یہ ہے کہ دینِ اسلام ایں دم جاری و ساری ہے اور کسی صحت مند نامیاتی وجود کی طرح یہ از خود اپنے مردہ حصّوں کی تجدید نو کرتا چلا جاتا ہے۔ اسلام کو اپنے محکمات کے مرکز سے اتنی قوّت حاصل ہوتی رہتی ہے کہ نئی نئی صورتوں میں اپنے متبعین کو ہدایات دے سکے۔ اسلام میں فکرِ نو کی اس صلاحیت کو اجتہاد کی اصطلاح کے حوالے سے سمجھا جا سکتا ہے۔

چونکہ اسلام فی الاصل صحیح نصب العین کے حیاتِ انسانی کے جملہ گوشوں پر اطلاق کا دوسرا نام ہے، یہ آج تک زندہ ہے اور رہتی دنیا تک باقی رہے گا۔ اگر کبھی حالات کی نامساعدت اسے مسلمانوں کی حیاتِ اجتماعی کے کسی گوشے سے خارج کر بھی دے، تو یہ بہت جلد اپنے آپ کو غالب کر کے اس گوشے پر دوبارہ حاوی ہو جاتا ہے۔ جس طرح ایک ایسا نامیاتی وجود جو قوت اور جوشِ حیات سے لبریز ہو، بیماری کے خلاف برسرِ پیکار ہو کر اپنی صحت بحال کر لیتا ہے، بالکل اسی طرح اسلام خارجی اور داخلی ہر قسم کے مخالفانہ عناصر کے خلاف مدافعت کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ اسلام کی یہ خوبی ہے کہ اس کے دائرہ اثر میں کوئی مخالفِ دین فکری تحریک پنپ نہیں سکتی۔ یہی سبب ہے کہ مسلمان جدید دور کے لادینی فکر کے علی الرغم اسلامی دینی ریاست کے قیام کے خواہاں ہیں اور انہوں نے

اس کے لیے بڑی سے بڑی قربانی ماضی قریب میں دی ہے اور آئندہ بھی اس کے لیے تیار ہیں۔

اسلامی نظریۂ حیات کے اہم خدوخال

اسلامی نظریۂ حیات کے اہم ترین خدوخال ان اطوارِ عبودیت اور اخلاقی ضابطوں سے متعلق ہیں جو عہدِ رسالت سے مسلمانوں کو منتقل ہوتے چلے آئے ہیں۔ جیسا کہ قبل ازیں وضاحت سے کہا جاچکا ہے، یہ خدوخال ہمیشہ مسلمانوں کی ہیئتِ اجتماعیہ میں باقی رہنے ضروری ہیں۔ اسلامی نظریۂ حیات کے اہم ترین اور بنیادی ارکان یہ ہیں:

(۱): کلمۂ شہادت یعنی یہ گواہی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے آخری رسول ہیں۔

(۲): صلوٰۃ یعنی پنج وقتہ باجماعت نماز کا اہتمام۔

(۳): زکوٰۃ یعنی متعیّن شرح سے فاضل سرمائے کا کچھ حصہ معاشرے کے غریب اور نادار لوگوں کی اعانت اور فلاح و بہبود میں صرف کرنا۔

(۴): صوم یعنی سال بھر میں ماہِ رمضان کے روزے۔

(۵): حج، یا معیّن اوقات میں بیت اللہ کا حج و زیارات اور منیٰ و عرفات میں مسلمانوں کے عالمی اجتماع میں شرکت۔

مندرجہ بالا پانچ ارکان اسلام میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں اور ان ہی کی اساس پر اسلامی تہذیب و ثقافت کا قصرِ رفیع تعمیر ہوتا ہے۔ اسلام کی تمام تر خوبصورتی اور شان و شوکت کا انحصار ان ارکان کی پائیداری پر ہے۔ چونکہ ان ارکان اور عقائد کا تعلق انسان کی ابدی اور غیر متبدّل فطرت سے ہے، اس لیے ان میں بوسیدگی اور غیر متعلق ہونے کا عنصر کبھی پیدا نہیں ہوسکتا۔ درحقیقت ان سے نہ صرف انسانی شخصیت کو ہمیشہ جلا ملے گا بلکہ یہ انفرادی اور اجتماعی دونوں اعتبار سے حیاتِ اجتماعی کے روحانی و اخلاقی ارتقاء کی ضمانت فراہم کرتے ہیں۔ مزید برآں مادی اعتبار سے بھی ان کے فوائد بے شمار ہیں۔

اس فکر کی تردید کہ ظواہر اسلام کا ابدی اور ضروری حصّہ نہیں ہیں

سطورِ بالا میں سوال نمبر ۴ کے جواب کے ضمن میں یہ وضاحت کی جا چکی ہے کہ اسلام کا معاملہ دوسرے نظریہ ہائے حیات سے اس اعتبار سے مختلف ہے کہ ان میں ظاہری رسوم و رواج کی صورتیں بدلتی رہتی ہیں لیکن اسلام میں ظاہری رسوم اور عبادات کی اہمیت انتہائی زیادہ ہے اور یہ کہنا درست نہیں کہ ہمیں ان کی بجائے صرف اسلام کے بعض آفاقی پہلوؤں یا بنیادی اخلاقی تعلیمات ہی کو اہمیت دینی چاہیے۔ اسلام میں مناسکِ عبودیت کی بھی اتنی اہمیت ہے جتنی اخلاقیات کی۔ اس لیے انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی شکل کے مطابق جاری رکھنا ضروری ہے۔ تجدّد پسند حضرات کا یہ خیال کہ اسلام میں ظاہری عبادات کی چنداں اہمیت نہیں، متعدد مغالطوں کی پیداوار ہے۔ ان میں سے ایک مغالطہ یہ ہے کہ فطری نظریہ ہائے حیات کے خارجی خدوخال صرف تبدیل ہوتے ہیں کسی کمال کی جانب ارتقا پذیر نہیں ہوتے۔ دوسرا مغالطہ جس کا یہ لوگ شکار ہوتے ہیں، یہ ہے کہ متعیّن ظاہری و خارجی اعمال کی کسی فطری نظریۂ حیات کو ضرورت نہیں ہوتی اور ان کی تبدیلی سے اس کی بنیادی و مرکزی تعلیمات پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ امر واقعہ یہ ہے کہ یہ مغالطے حیاتِ انسانی کے خصائل و اوصاف کے بارے میں غلط نظریہ رکھنے سے پیدا ہوتے ہیں۔ حیاتیاتی اور نفسیاتی سطح پر جس طرح انسان ارتقاء کر رہا ہے وہ خود اس بات کا متقاضی ہے کہ بعض مناسکِ عبودیت اور خارجی اعمال و رسوم کو مسلسل جاری رکھا جائے۔

واقعہ یہ ہے کہ جس طرح کسی حیاتیاتی وجود کے لیے خارجی شکل و صورت اور وجود لازمی ہے اسی طرح مذہب یا نظریۂ حیات کے لیے بھی خارجی اعمال اور رسوم ازبس ضروری ہیں جس طرح انسان جسمانی وجود اور رُوح کا مجموعہ ہے، اسی طرح ہر نظریۂ حیات بھی دو عناصر یعنی روحانی و اخلاقی تعلیمات (جو اس کا اصل جوہر ہوتا ہے) اور مخصوص خارجی اعمال و عبادات پر مشتمل ہوتا ہے۔ حیاتیاتی وجود کی طرح کسی نظریۂ حیات کے یہ دونوں عناصر ایک وحدت کے طور پر سامنے آتے ہیں اور ان کی تمام تر فعالیت اور اثر انگیزی اسی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔

ارتقائی عمل خواہ حیاتیاتی سطح پر ہو یا نفسیاتی سطح پر، دراصل خارجی ظواہر کے ارتقاء کا نام ہے

اور ظواہر کے بعض عناصر نفسیاتی اور حیاتیاتی ہر دو سطحوں پر یہ تقاضا کرتے ہیں کہ ان میں کوئی تبدیلی نہ ہو۔ ارتقاء کی حیاتیاتی سطح پر تمام نامیاتی افراد کی ایک ہی خواہش ہوتی ہے اور وہ یہ کہ زیادہ سے زیادہ فعالیت کے ساتھ اپنا وجود برقرار رکھ سکیں لیکن اس خواہش کو بدرجۂ اتم صرف انسان ہی حاصل کر سکا بعینہٖ ارتقاء کے نفسیاتی سطح پر تمام نظریہ ہائے حیات کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ ان کا مطلوبہ ہدف یا نصب العین زیادہ سے زیادہ متوازن اور حسین ہو۔ لیکن جیسا کہ گزشتہ صفحات میں تفصیل سے بیان کیا جا چکا ہے، نظریہ ہائے حیات میں سے صرف دین اسلام اس نصب العین کو بتمام و کمال حاصل کر سکا ہے۔ متعین اور مستقل خارجی صورت کے بغیر کوئی نظریہ حیات یا آئیڈیالوجی اتنی ہی بے کیف اور زندگی سے عاری ہو گی جتنی کوئی نامیاتی ہستی بغیر مادی وجود کے ہوتی ہے۔

مکمل ترین آئیڈیالوجی کے تمام اوصاف اسلام میں پائے جاتے ہیں:

اسلام کے بحیثیت پیغمبرانہ نظریۂ حیات چند اور عقائد بھی اہم ہیں جن کی اہمیت بالخصوص اس وجہ سے بھی ہے کہ اسلام کو نبی آخر الزمان (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہر پہلو سے مکمل کر دیا اور یہ آسمانی ہدایت کا آخری ایڈیشن ہے:

(۱) اسلام خالق کائنات کی توحید اور اس توحید کی صمدیت پر بے انتہا زور دیتا ہے۔ اس کی ذات و صفات میں کوئی شریک یا ساجھی نہیں ہے۔ قرآن وضاحت کے ساتھ یہودیوں اور نصرانیوں کی عقیدۂ توحید میں ملاوٹ اور گمراہیوں کا ذکر کرتا ہے اور یہ کہ کس طرح انہوں نے اس تصورِ الٰہ ہی کو مسخ کر ڈالا جو ان کے نبیوں نے پیش کیا تھا۔ مسلمانوں میں آنحضورؐ کے بارے میں کبھی یہ خیال پیدا نہیں ہوا کہ وہ اللہ کی صفات سے متصف ہیں، حالانکہ امت کے ہر فرد کو آپؐ سے انتہائی محبت و عقیدت رہی ہے۔ مسلمانوں نے آپؐ کو ہمیشہ ایک بشر اور اللہ کا برگزیدہ بندہ سمجھا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ توحید باری تعالیٰ وہ مرکزی اور بنیادی عقیدہ ہے جس سے نصب العینی محبت کو صحیح رُخ پر پروان چڑھایا جا سکتا ہے اور اس عبادت اور اخلاقی عمل کو صحیح رُوح کے ساتھ انجام دیا جا سکتا ہے جو تخلیق انسان کی واحد غرض و غایت ہے۔

(۲) بعض خصوصیات وہ ہیں جو اسلام کے آخری اور مکمل ترین دین ہونے کی وجہ سے ہمارے سامنے

آتی ہیں اور خود قرآن نے ان کو بالصراحت بیان کیا ہے :

(ا) یہ کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سلسلہ نبوت کی آخری کڑی ہیں اور آپؐ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ چنانچہ خود آنحضورؐ کا قول ہے :

لَا نَبِیَّ بَعْدِی (یعنی میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا)۔

(ب) آنحضورؐ کی تعلیمات میں گزشتہ تمام نبیوں کی جملہ تعلیمات نقطۂ کمال و عروج تک پہنچی ہیں چنانچہ قرآن کا ارشاد ہے :

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ط (المائدۃ : ۳)

(آج میں نے تمہارا دین تمہارے لیے مکمل کر دیا اور تمہارے اُوپر اپنی نعمت کا اتمام کر دیا اور تمہارے لیے دین اسلام کو پسند کر لیا)

(ج) آنحضورؐ کو دی گئی کتاب ہدایت یعنی قرآن مجید رہتی دنیا تک بلا کم و کاست محفوظ و مامون رہے گی اور اس کا ذمہ خود خالق کائنات نے لیا ہے۔ قرآن کریم کے الفاظ میں :

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ ○ (الحجر : ۹)

(بے شک اس ذکر کو ہم نے اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔)

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ورودِ مسعود دنیا میں اُس وقت ہوا جب تاریخ کی روشنی پوری آب و تاب سے موجود تھی۔ آپؐ کے صحابہؓ میں تاریخی حقائق سے وابستگی شدید تھی اور بالخصوص ان میں یہ صلاحیت بھی تھی کہ وہ تاریخی حقائق کو افسانوی قصص سے ممتاز کر کے تاریخی وقائع کو صحیح پس منظر میں دیکھ سکیں۔ نتیجۃً انہوں نے نہ صرف قرآن کریم کی کماحقہٗ حفاظت کی، بلکہ آنحضورؐ کی حیاتِ طیّبہ کے واقعات، سیرت اور آپؐ کے فرامین کو بھی آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ کر دیا۔ اگرچہ یہ بھی ہوا ہے کہ بہت سے دشمنانِ دین نے غلط باتیں بھی آنحضورؐ سے منسوب کر کے انہیں عام کر دیا، لیکن مسلمانوں کے اجماع اور خاص طور پر محدثینِ کرام کی انتھک محنت سے حدیث کی تدوین اور چھان پھٹک میں بڑی مدد ملی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ حدیث کی روایت اور پایۂ سند کے اعتبار سے درجے ہیں اور بہت سی روایات کے بارے میں محدثین نے اعتراض اٹھائے ہیں، لیکن اس سے بحیثیتِ

مجموعی حدیث کی ثقاہت پر حرف نہیں آتا بلکہ اس کی اہمیت اور تاریخی استناد کو مزید تقویت ملتی ہے۔ صحابہ کرامؓ، تابعینؒ اور تبع تابعینؒ نے حدیثوں کی جانچ پرکھ اور راویوں کے معیار کو متعین کرنے کے لیے ایسے ایسے علوم کو ایجاد کیا جن کی مثالیں تاریخِ عالم میں کہیں اور نہیں ملتیں۔

(د) حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تا قیامِ قیامت پوری دنیا والوں کی رشد و ہدایت کے لیے مبعوث کیا گیا ہے:

وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا (سبا: ۲۸)

(اور ہم نے آپ کو نہیں بھیجا مگر پوری انسانیت کے لیے بشیر اور نذیر بنا کر!)

وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ○ (الانبیاء: ۱۰۷)

(اور ہم نے آپ کو نہیں بھیجا مگر تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر!)

(ھ) آنحضورؐ کا لایا ہوا نظریۂ حیات یعنی دینِ اسلام تمام باطل نظریہ ہائے حیات کو مکمل شکست دے کر عالمی غلبہ حاصل کرے گا۔ چنانچہ از روئے قرآن آنحضورؐ کی بعثت کا مقصدِ وحید دینِ اسلام کا یہ ہمہ گیر غلبہ و اقتدار ہے:

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ۔ (التوبۃ: ۳۳، الفتح: ۲۸، الصّف: ۹)

(اللہ ہی وہ ہستی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق دے کر بھیجا تاکہ وہ اسے پورے نظامِ اطاعت پر غالب کر دے)

(و) نبی آخر الزّمان حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیروکار تمام فطری نظریہ ہائے حیات کے ماننے والوں میں سب سے بہترین امت ہیں اور انہیں پوری انسانیت کی راہنمائی اور ہدایت کی ذمّہ داری سونپی گئی ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ۔ (آل عمران: ۱۰۹)

"تم وہ بہترین اُمت ہو جسے لوگوں کے لیے اس لیے برپا کیا گیا ہے کہ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو"

(ز) نبی آخرالزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متبعین ہی مختلف نظریہ ہائے حیات کی کشمکش میں فاتح کی حیثیت سے اُبھریں گے بفحوائے آیت قرآنی:

اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○ (آل عمران: ۱۳۹)

"تم ہی غالب ہو کر رہو گے اگر تم سچے مومن ہو گے!"

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ، وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ط (النور: ۵۵)

"وعدہ کر لیا اللہ نے اُن لوگوں سے جو تم میں سے ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ وہ اُن کو زمین میں خلافت عطا کرے گا جیسے اُن سے پہلے لوگوں کو عطا کی تھی۔ اور جس دین کو اُس نے ان کے لیے پسند کیا ہے اس کو ان کے لیے جما کر رہے گا اور ان کے خوف کو امن سے بدل دے گا۔ وہ میری بندگی کریں گے، میرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں گے۔"

وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ (المنافقون: ۸)

"اور عزت (غلبہ) تو اللہ کے لیے ہے اور اس کے رسول کے لیے اور اہل ایمان کے لیے۔"

(ح) ذہن انسانی اور خارجی کائنات کے بارے میں قرآن میں مذکور حقائق سائنسی علوم میں ترقی کے ساتھ ساتھ مزید نکھر کر اور وضاحت کے ساتھ انسانوں کے علم میں آئیں گے، یہاں تک کہ کافر اور ملحد بھی آیاتِ قرآنیہ کا حق و صداقت پر مبنی ہونا تسلیم کر لیں گے:

سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ط (حٰمٓ السجدة: ۵۳)

"عنقریب ہم انہیں اپنی نشانیاں آفاق میں (بھی) دکھائیں گے اور خود ان کی جانوں میں (بھی)، یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ یہ (قرآن واقعۃً) برحق ہے۔"

سوال نمبر ۶۔ کیا اسلام میں غلام رکھنے کی اجازت ہے؟ اور کیا اسلام تعددِ ازدواج کو جائز قرار دیتا ہے؟

جواب: غلامی کا مسئلہ

ہم سب سے پہلے غلاموں کے مسئلے کو لیتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ کوئی نبی خلا میں اپنے پیغمبرانہ کام کا آغاز نہیں کرتا۔ نہ تو اس کی تعلیمات بالکل تجریدی نوعیت کی ہوتی ہیں اور نہ ہی وہ یہ سمجھتا ہے کہ پہلے سے کوئی سوسائٹی اپنے مخصوص طور طریقوں کے ساتھ موجود نہیں ہے۔ نبی جس معاشرے میں بھی مبعوث ہوتا ہے، اسے بہرحال اصلاح کا عمل اسی میں شروع کرنا ہوتا ہے اور وہ لامحالہ اس کی خرابیوں کی درجہ بدرجہ تطہیر سے کام شروع کرتا ہے۔ رسول اپنے معاشرے اور سوسائٹی میں پہلے سے پائی جانے والی رسوم اور عوائد کا خیال رکھتا ہے اور ان میں اصلاح کا کام دفعۃً نہیں کرتا بلکہ اس میں ایک فطری تدریج ملحوظ رکھتا ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو اس بات کا امکان ہے کہ لوگ اس کی تعلیمات پر قطعاً کان نہ دھریں۔

انسانی فطرت کے تقاضوں کا پورا پورا خیال رکھنے والے نظریۂ حیات کے اعتبار سے اسلام (جسے نبی آخر الزماںؐ لے کر آئے) انسانی طبیعت اور انسانی سوسائٹی کے بارے میں ارتقاء پسند فکر رکھتا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ پوری کائنات کے بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر ارتقائی ہے۔ اس نقطۂ نظر کے مطابق اسلام کا موقف یہ ہے کہ فرد انسانی اور انسانی معاشرہ میں صرف درجہ بدرجہ اور فطری تدریج جذبات پہلے دل میں پیدا ہوتے ہیں جن کے زیر اثر اعضاء و جوارح سے درست اعمال سرزد ہوتے ہیں۔ خارج میں صرف قوانین کی عملداری سے حقیقی تبدیلی نہیں لائی جا سکتی۔ جوں جوں قلب و ذہن میں خدا کی معرفت اور محبت جاگزیں ہوتی جاتی ہے، خارجی اعمال خود بخود درست ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ذہنی و قلبی تبدیلی کے بغیر کوئی شخص قانون کے جبر کے تحت کوئی عمل کرتا بھی ہے تو وہ حقیقی معنوں میں اچھا اخلاقی و دینی عمل نہ ہوگا۔ اسلام نے فطری تدریج کے اصول کو بعض دوسری برائیوں کے تدارک کی طرح غلامی کے خاتمے کے سلسلے میں بھی ملحوظ رکھا ہے۔ اسلام نے اس ضمن میں اسی عرب معاشرے کو اپنے سامنے رکھا ہے جس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا گیا اور جو سب سے پہلے آپؐ کی دعوت و تبلیغ کا مخاطب بنا۔

مثال کے طور پر اسلام شراب پینے کی بالصراحت ممانعت کرتا ہے اور مندرجہ ذیل آیت

میں اس کی حرمت مذکور ہے:

رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ (المائدۃ: ۹۰)

"(یہ سب) گندے شیطانی کام ہیں، پس ان سے باز رہو!"

لیکن یہ تاریخی حقیقت ہے کہ اس حکم کی آخری تنفیذ مختلف مراحل سے گزر کر ہوئی مثلاً شروع شروع میں شراب کے استعمال کو برقرار رکھا گیا اس شرط یا قید کے ساتھ کہ حالتِ سکر میں کوئی شخص نماز نہ پڑھے یعنی نماز پڑھنے کے لیے لازمی ہے کہ وہ پورے طور پر ہوش وحواس میں ہو:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَأَنتُمْ سُكَارَىٰ حَتَّىٰ تَعْلَمُوا مَا تَقُولُونَ۔

"اے ایمان والو، نزدیک نہ جاؤ نماز کے جبکہ تم نشے میں ہو، یہاں تک کہ (نشہ اتر جائے اور) تم سمجھنے لگو جو کہتے ہو۔"

اس ہدایت کا مقصد صاف طور پر یہ تھا کہ مسلمانوں کو رفتہ رفتہ شراب کو کاملتاً چھوڑنے کے لیے تیار کیا جائے۔ چونکہ ذکر یعنی نماز کی اہمیت ان کے نزدیک شدید تھی اور شراب سے اس کی مغائرت پیدا کر کے مسلمانوں کے ذہنوں میں اس کے استعمال سے بُعد پیدا کرنا مقصود تھا، اس لیے یہ حکم دیا گیا کہ حالتِ نشہ میں نماز کے قریب بھی نہ جائیں۔ بالکل اسی طرح اسلام اس بات کا سخت مخالف ہے کہ کچھ لوگ دوسروں کے غلام ہوں کیونکہ ان سب کا پیدا کرنے والا اللہ ہے اور سبھی ایک انسانی جوڑے کی اولاد ہیں، اور یہ کہ اسلام میں کوئی شخص پیدائشی طور پر افضل و برتر نہیں بلکہ شرفِ انسانیت میں سب برابر ہیں اور فضیلت و بزرگی کی بنیاد صرف خدا خوفی اور تقویٰ میں زیادتی ہے۔ کوئی شخص نسل، زبان، یا رنگ کی بنیاد پر کسی دوسرے پر برتری نہیں رکھتا۔ یہ سب چیزیں صرف باہمی تعارف میں معاونت کے لیے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی خلاقیت کی نشانیاں ہیں:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا ۚ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ ۚ

(الحجرات: ۱۳)

"اے لوگو، ہم نے تم (سب) کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور (پھر) تم کو

کنبوں اور قبیلوں میں (تقسیم) کر دیا تاکہ ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔"

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ ط (الروم: ۲۲)

"اور اس کی نشانیوں میں سے ہے آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا مختلف ہونا۔"

تمام مسلمانوں کو ایک دوسرے کا بھائی قرار دیا گیا ہے بفحوائے آیت قرآنی:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ (الحجرات: ۱۰)

یقیناً (تمام) مسلمان بھائی بھائی ہیں۔

صاف ظاہر ہے کہ کوئی بھائی دوسرے بھائی کا غلام اور کوئی کسی کا آقا نہیں ہو سکتا یعنی اس آیت سے غلامی کی مکمل نفی ہو جاتی ہے۔ مزید برآں غلاموں کو خرید کر آزاد کر دینے کو بہت بڑی نیکی کا کام قرار دیا گیا ہے۔ اس عمل کو انفاق فی سبیل اللہ کی طرح نہ صرف ایمان و تقویٰ کی ناگزیر شرط قرار دیا گیا ہے بلکہ ان لوگوں کا شیوہ بتایا گیا ہے جو جنت میں داخل ہوں گے:

فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ○ وَمَا اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ○ فَكُّ رَقَبَةٍ ○ اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ ○ يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ○ اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ○ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ○ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ○ (البلد: ۱۱ تا ۱۸)

"مگر وہ اس دشوار گزار گھاٹی کو عبور نہ کر سکا۔ اور تم کیا جانو کہ کیا ہے وہ دشوار گزار گھاٹی؟ کسی گردن کو غلامی سے چھڑانا یا فاقے کے دن کسی قریبی یتیم یا خاک نشین مسکین کو کھانا کھلانا۔ پھر (اس کے علاوہ یہ کہ) آدمی اُن لوگوں (کے زمرے) میں ہو جو ایمان لائے اور ایک دوسرے کو صبر اور (خلقِ خدا پر) رحم کرنے کی تلقین کرتے رہے۔ یہ لوگ ہیں بڑے نصیب والے!"

دوسری جانب قرآن میں یہ صراحت موجود ہے کہ جو کوئی اس کے جملہ احکامات کو بشمول اس حکم کے کہ غلاموں

کو آزاد کیا جائے۔) درخورِ اعتنا نہیں سمجھے گا وہ دوزخ میں جھونک دیا جائے گا۔ چنانچہ اگلی ہی دو آیات کریمہ یہ ہیں: وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا هُمْ اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ ○ عَلَيْهِمْ نَارٌ مُّؤْصَدَةٌ ○ (البلد : ۱۹ - ۲۰)

"اور جن لوگوں نے ہماری آیات (کو ماننے) سے انکار کیا وہ میں کمبختی والے۔ ان پر (دوزخ کی) آگ (ڈھانک کر) بند کر دی جائے گی۔"

تاہم اللہ تعالیٰ نے اس بات کا خیال رکھا ہے کہ غلامی کو یک لخت ختم کر دینا شاید اُس معاشرے میں ممکن نہ تھا اور ویسے بھی اس سے بے شمار معاشی اور سماجی مسائل پیدا ہو جاتے۔ چنانچہ قرآن نے اس میں تدریج سے کام لیا اور مسلمانوں میں رفتہ رفتہ وہ اخلاقی حس بیدار کی جس کی وجہ سے اہلِ ایمان نے از خود نیکی کے حصول کے لیے اپنے غلاموں کو آزاد کیا اور اس تعلیم کو خارج سے جبر کے ساتھ عمل کروانے والی تعلیم نہ سمجھا۔ چنانچہ جب تک کسی مسلمان کے لیے یہ ناممکن تھا کہ وہ اپنے غلام آزاد کر سکے، اس کے لیے یہ تاکید تھی کہ وہ ان کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آئے، یہاں تک کہ مالک و غلام میں کوئی فرق نہ رہے۔ چنانچہ قرآنی احکام کا مقصد نہ صرف غلامی کے ادارے کی خرابیوں کا رفتہ رفتہ تدارک تھا بلکہ مسلمانوں میں اس مثبت جذبے کا پیدا کرنا بھی تھا جس کے تحت وہ اپنی مرضی سے غلاموں کو آزاد کر دیں۔ اسی حکمت کے تحت مسلمانوں کو مکاتبت کے اصول کو اپنانے کا بھی حکم دیا گیا۔ سب سے اہم نکتہ یہ ہے کہ قرآن اور سنّتِ رسولؐ دونوں سے نئے غلاموں کی خرید و فروخت کا قطعاً کوئی جواز نہیں نکالا جا سکتا۔ جب کہ متعدد حوالوں سے غلاموں کو آزاد کرنے کی ترغیب کثرت سے ملتی ہے۔

اپنی جگہ یہ حقیقت تاریخی طور پر ناقابلِ تردید ہے کہ اسلام کی تعلیمات نے غلامی کے ادارے کا بالکل خاتمہ کر دیا۔ چنانچہ اس امر کا اعتراف غیر مسلم بھی کرتے ہیں کہ جہاں جہاں اسلام گیا وہاں سے غلامی کی لعنت ختم ہو گئی۔ لندن کے اخبار "ٹائمز" (۱۴ نومبر ۱۸۸۷ء) میں شائع شدہ سر جوزف تھامسن کے خط کا مندرجہ ذیل حصہ اس حقیقت پر مہرِ تصدیق ثبت کرتا ہے:

"مشرقی وسطیٰ افریقہ میں طویل ترین قیام اور مشاہدے کے بعد میں بلا خوفِ تردید کہتا ہوں کہ اگر اس علاقے میں غلاموں کی خرید و فروخت زوروں پر ہے تو اس کی وجہ وہاں اسلام کا نہ پہنچنا ہے۔ وہاں اسلام کی اشاعت و ترویج سے یقیناً غلاموں کی تجارت میں خاطر خواہ کمی واقع ہوتی۔"

صدر مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن اور امیر تنظیم اسلامی

ڈاکٹر اسرار احمد

کی علمی و فکری اور دعوتی و تحریکی کاوشوں کا نچوڑ

۲۸۰ صفحات پر مشتمل ایک اہم علمی دستاویز جس میں علمی خطوط کی نشاندہی بھی موجود ہے

دعوت رجوع الی القرآن

کا منظر و پس منظر

چھپ کر آگئی ہے ـــــ ضرور مطالعہ کیجئے ـــــ دوسروں تک پہنچائیے

■ سفید کاغذ ■ عمدہ کتابت ■ دیدہ زیب طباعت ■ قیمت مجلد -/۶۵ روپے ■ غیر مجلد -/۵۰ روپے

ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم

خودی اور رحمۃ للعلمین ﷺ (۵)

خودی کی ایک اہم خصوصیت

اطاعتِ رسولؐ اور اقتدائے رفتگاں پر زور دینے کی وجہ سے اقبال کے بعض نادان نکتہ چین اسے ملّائیت اور تحجّر اور جمود کا طعنہ دیتے ہیں۔ دراصل ایسے لوگ اقبال کی حکیمانہ بصیرت سے بے خبر اور اس کے فکر کی گہرائیوں سے ناآشنا ہیں۔ خودی یا زندگی کی ایک بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اپنی ترقی کے کسی مرحلہ کے آغاز میں جو بھی نئی شکل وہ اختیار کرتی ہے، خواہ وہ ظاہری اسباب اور حالات جنہوں نے اس شکل کا اختیار کرنا اس کے لیے ممکن بنایا ہو کچھ ہوں، وہ شکل ہمیشہ کے لیے طے پا جاتی ہے اور آئندہ کے لیے اس میں کسی قسم کا ردّوبدل ممکن نہیں ہوتا۔ اور زندگی خواہ حیاتیاتی سطحِ ارتقاء پر کارپرداز ہو یا نظریاتی سطحِ ارتقاء پر یہ بات ہر حالت میں درست رہتی ہے۔

مثلاً ایک نومولود بچہ کی شکل وصورت اور خدوخال کی جو تفصیلات آغازِ حیات میں مقرر ہو جاتی ہیں وہی زندگی کے آخری لمحہ تک چلی جاتی ہیں اور نشوونما سے حجم اور وضاحت کے سوائے ان میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔ اسی طرح سے جب کسی حیاتیاتی تقلیب کے نتیجہ کے طور پر ایک نئی نوعِ حیوانات کا جدِّ اوّل یا پہلا فرد وجود میں آتا ہے تو اس کی شکل وصورت اور اعضاء وجوارح کی جو خصوصیات اس کے جسم میں ظہور پذیر ہوتی ہیں وہ اس کی نوع میں نسلاً بعد نسل جب تک کہ نوع باقی رہے ہمیشہ موجود رہتی ہیں۔ زندگی کے عمل کی ان خصوصیات کی وجہ سے ایک نوعِ حیوانی یا تو اپنی ابتدائی اور اصلی صورت پر ہمیشہ قائم رہتی ہے اور یا پھر کلیۃً مٹ جاتی ہے، لیکن بدلتی نہیں۔

اسی طرح سے جب کسی نظریاتی تقلیب کے نتیجہ کے طور پر ایک نئی قدر (یعنی نبوتی) نظریاتی جماعت کا جدِّ اوّل یا پہلا فرد ظہور پذیر ہوتا ہے تو عمل کے وہ قواعد اور رسوم اور قوانین اور طریقے جو اس

کے نظریہ کے خصائص ہوتے ہیں اور جن کو مجموعی طور پر اس کا قانونِ شریعت کہا جاتا ہے اس کی نظریاتی جماعت یا اُمّت میں نسلاً بعد نسلٍ جب تک کہ وہ اُمّت باقی رہے، ہمیشہ موجود رہتے ہیں۔ زندگی کی خصوصیات کی وجہ سے ایک نوع حیوانی کی طرح ایک نبیؑ کی نظریاتی جماعت بھی یا تو اپنی ابتدائی اور اصلی صورت پر ہمیشہ باقی رہتی ہے یا اگر اس میں زندہ رہنے کی صلاحیت نہ ہو تو کلیتہً مٹ جاتی ہے لیکن بدلتی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب تک ایک مذہب زندہ رہتا ہے اس کے پیرو اپنی پوری قوت کے ساتھ اپنے اندر الحاد اور بدعت کے نمودار ہونے کو روکتے رہتے ہیں جس طرح سے حیاتیاتی وراثت کا قانون ایک نوع حیوانی کی اصلی شکل وصورت کی حفاظت ایک ایسے انتظام سے کرتا ہے جو جسم حیوانی کے اندر موجود ہوتی ہے، اسی طرح سے نظریاتی وراثت کا قانون بھی ایک نبوّتی نظریاتی جماعت کی شریعت کی حفاظت ایک ایسے انتظام سے کرتا ہے جو انسان کی فطرت کے اندر موجود ہوتا ہے جسم حیوانی کے اندر کام کرنے والے وہی حیاتیاتی قوانین جو اس کے لیے توالد کو ممکن بناتے ہیں، حیوان کی آئندہ نسلوں کو ان کے جدِّ اوّل کی شکل وصورت سے ذرّہ بھر انحراف کرنے نہیں دیتے۔ اسی طرح سے فطرتِ انسانی کے وہی نفسیاتی قوانین جو کسی انسان کے لیے ممکن بناتے ہیں کہ وہ کسی نبیؑ پر ایمان لائے اور اس کی روحانی اولاد قرار پاتے، نبیؑ پر ایمان لانے والوں کی آئندہ نسلوں کو اس کی شریعت سے سرِمو انحراف کرنے نہیں دیتے۔ قرآن حکیم نے ذیل کی آیاتِ مبارکہ میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (النساء: ۶۴)

اور ہم نے جو بھی پیغمبر بھیجا اسی لیے بھیجا کہ خدا کے حکم کے مطابق اس کی اطاعت کی جائے۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝ (النساء: ۶۵)

تمہارے پروردگار کی قسم جب تک یہ لوگ اپنے تنازعات میں تمہیں حکم نہ بنائیں اور حکم بنانے کے بعد آپ جو فیصلہ کریں اس کے متعلق اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں بلکہ خوشی سے سرِتسلیم خم کر دیں اُس وقت تک ایمان دار شمار نہیں ہوں گے۔

خودی کی اس خصوصیّت کا نتیجہ

زندگی کی اس خصوصیت کی وجہ سے انسان کی نظریاتی زندگی سے قریب کا تعلّق رکھنے والا کوئی قول یا فعل جو نبیؐ سے سرزد ہوتا ہے خواہ وہ کسی اتّفاق کا یا سلسلۂ اتّفاقات کا نتیجہ ہو یا اس کے فوری اسباب اور حالات کچھ ہوں، وہ اس کی اُمّت کے لیے تا قیامت شریعت کا ایک قانون بن جاتا ہے، جس کی دیدہ و دانستہ نافرمانی انسان کو ارتقاء کی شاہراہ سے ہٹا دیتی ہے اور اس شاہراہ سے ہٹے ہوئے غلط راستوں پر پڑی ہوئی نظریاتی جماعتوں میں شامل کر دیتی ہے جن کے لیے مٹ جانا مقدر ہے۔ قرآن حکیم نے اس شاہراہِ ارتقاء کو جو صرف ایک ہی ہے "صراطِ مستقیم" کہا ہے اور اس سے ہٹے ہوئے غلط راستوں کو جو بہت سے ہیں "سُبُل" کہا ہے۔

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ط وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ ط (الانعام: ۱۵۴)

اور بے شک یہ میرا راستہ سیدھا راستہ ہے، اس کی پیروی کرو۔ اور چھوٹے چھوٹے بہت سے راستوں کی پیروی نہ کرو جو تمہیں خدا کے راستہ سے ہٹا دیں۔

یہی سبب ہے کہ قرآن حکیم نے صحابہؓ کو منع فرمایا تھا کہ وہ حضرت موسیٰؑ کی اُمّت کی طرح اپنے رسولؐ سے زیادہ سوالات کر کے اپنے دین کو پیچیدہ اور مشکل نہ بنائیں۔

اَمْ تُرِیْدُوْنَ اَنْ تَسْـَٔلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوْسٰی مِنْ قَبْلُ۔ (البقرۃ: ۱۰۸)

کیا تم چاہتے ہو کہ اپنے رسولؐ سے بے ضرورت ایسے سوالات کرو جیسے کہ بنی اسرائیل کی طرف سے حضرت موسیٰ سے کیے گئے تھے۔

اور یہی سبب ہے کہ حضور رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود بھی ایسے اقوال اور افعال سے احتیاط فرماتے تھے جو امّت کے لیے دین کو مشکل بنا دیں۔ کیونکہ ضروری تھا کہ ان کو نظر انداز کرنے سے رسولؐ کی نافرمانی لازم آئے۔

خودی کی اس خصوصیّت کے بغیر ارتقاء ممکن نہ ہوتا

زندگی کی اس بنیادی خصوصیّت کی روشنی میں یہ بات آشکار ہو جاتی ہے کہ کیوں رحمۃ للعلمینؐ کے عطا کیے ہوئے نظریۂ حیات کے اندر اس بات کی ایک طاقتور اور ناقابلِ انسداد صلاحیت موجود ہے کہ وہ ہمیشہ اسی حالت پر باقی رہے جس پر اس کے بانی نے اسے چھوڑا تھا۔ زندگی کی یہ خصوصیّت دراصل ارتقاء کی ضروریات کے تابع وجود میں آئی ہے۔ اگر زندگی میں یہ خصوصیت نہ ہوتی تو جب اس کی انتھک کوششوں سے کروڑوں برس کے حیاتیاتی ارتقاء کے بعد انسان کی صورت میں جسمانی اور دماغی لحاظ سے ایک حیرت انگیز طور پر مکمل جسمِ حیوانی وجود میں آیا تھا تو اس بات کی کوئی ضمانت نہ ہوتی کہ وہ آئندہ کے نہایت ہی مشکل اور بدلتے ہوئے حالات کے باوجود اپنے حیاتیاتی کمالات کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے قائم رکھ سکے گا اور اس طرح سے آئندہ کے پورے ارتقاء کا ایک قابلِ اعتماد راستہ بن سکے گا۔ پھر اسی طرح سے اگر زندگی میں یہ خصوصیت نہ ہوتی تو جب لاکھوں برس کے نظریاتی ارتقاء کے بعد ایک رحمۃ للعلمینؐ کی مقدّس زندگی کی صورت میں ایک حیرت انگیز طور پر مکمل نظریۂ حیات وجود میں آیا تھا تو اس بات کی بھی کوئی ضمانت نہ ہوتی کہ وہ نظریۂ حیات آئندہ کے نہایت ہی مشکل اور بدلتے ہوئے حالات کے باوجود اپنے نظریاتی محاسن اور کمالات کو تاقیامت قائم رکھ سکے گا اور اس طرح سے بعد کے پورے ارتقائے انسانیت کا ایک قابلِ اعتماد ذریعہ بن سکے گا۔ قدرت کا قانونِ وراثت خواہ حیاتیاتی ہو یا نظریاتی، وہ نہ صرف ارتقاء کے منافی نہیں بلکہ ارتقاء کے لیے اربس ضروری ہے۔ اس کے بغیر زندگی نہ تو اپنی گزشتہ حاصلات کو محفوظ کر سکتی تھی اور نہ ہی ان کی بنیادوں پر آئندہ کے حاصلات کی تعمیر کر سکتی تھی۔ یہ قانون اس بات کا ضامن ہے کہ کوئی تغیر یا تو مقاصدِ ارتقاء کے لیے مفید ہوگا اور اس راستہ پر ظہور پذیر ہوگا جو صحیح ہے اور ارتقاء کی بلند تر منزلوں کی طرف جاتا ہے اور یا پھر اس کو فنا کی قوتوں کے سپرد کر دیا جائے گا تاکہ وہ اسے زود یا بدیر مٹا کر رہیں۔

ہمارے فکر و عمل میں آئندہ کا ارتقائی تغیّر

انسانی شاہراہِ ارتقاء کی منزلِ مقصود مغرب کے غلط نظریات نہیں بلکہ نظریۂ حیات کی وہ صورت ہے جو رحمۃ للعلمینؐ کی عملی زندگی میں آشکار ہوئی تھی۔ لہٰذا مسلمان قوم کے اندر مستقبل میں جو تغیر رونما

ہونے والا ہے وہ یہ نہیں کہ وہ مغرب کے کسی غلط نظریۂ حیات کے پیرو بن جائیں گے بلکہ قرائن سے ظاہر ہو رہا ہے کہ مسلمان قوم میں ارتقاء کی منزلِ مقصود کی طرف آئندہ کا تغیر یہ ہونے والا ہے کہ وہ اپنے لیے ایک جدید اسلامی نظامِ تعلیم نافذ کرے گی جس کے ذریعہ سے وہ طبعیاتی، حیاتیاتی اور نفسیاتی یا انسانی علوم میں سائنسی حقائق کو عقیدۂ توحید کی روشنی میں منظم کر کے عقیدۂ توحید کو ایک ایسی زبردست علمی اور عقلی قوت بنائے گی جو مخالفوں کے دلوں کو بھی مسخر کرے گی اور جس کی وجہ سے عالمِ انسانی امن اور اتحاد کی نعمتوں سے ہمکنار ہوگا۔ اور ایسا نظر آتا ہے کہ اس پُر امن عالمگیر علمی انقلاب کا آغاز پاکستان سے ہوگا۔

آخری قوم کے اعزاز کی شرط

زندگی کے ان حقائق سے ظاہر ہے کہ اگر ہم مسلمان چاہتے ہیں کہ ہم فی الواقع دنیا کی آخری قوم ہونے کا اعزاز حاصل کریں جو کائنات کی حرکتِ ارتقاء کا مقصود اور مدّعا ہے اور جو اقوامِ عالم کی راہ نما اور زمین کی وارث ہونے والی ہے تو ہم کو چاہیے کہ رحمۃٌ للعٰلمینؐ کے ہر قول اور فعل کو، جو تاریخ کے معیاروں کے مطابق حضورؐ کا قول اور فعل ثابت ہو چکا ہے یا تواتر اور توارث سے ہم تک پہنچا ہے، نہایت ہی گہرے عاشقانہ احترام کے ساتھ اپنی نظریاتی زندگی کا راہ نما بنائیں۔ اسی لیے اقبال کا یہ شعر:

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

کسی بے بنیاد خوش فہمی پر مبنی نہیں، بلکہ خودی کی لازوال فطرت کے ٹھوس حقائق پر مبنی ہے۔

اگر ہم رحمۃٌ للعٰلمینؐ کی مکمل اطاعت بجا نہ لاسکیں تو پھر ایسا تو نہیں ہو سکتا کہ ارتقائے انسانیت اپنی منزلِ مقصود کی طرف آگے نہ بڑھے۔ زندگی کی غیر متبدل خصوصیات کی وجہ سے اس کا نتیجہ سوائے اس کے کچھ نہ ہوگا کہ ارتقاء کی قوتیں ہمیں مٹا کر ایک اور قوم کو ہماری جگہ پر لائیں گی۔ جو ہماری طرح نہیں ہوگی بلکہ رحمۃٌ للعٰلمینؐ کی سچّی اور عاشقانہ اطاعت کی وجہ سے درحقیقت اس قابل ہوگی کہ حرکتِ ارتقاء کا مقصود اور مدّعا اور اقوامِ عالم کی راہ نما اور زمین کی وارث قرار پائے۔ قرآن حکیم میں اس حقیقت کا اظہار ان الفاظ میں ہوا ہے:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (آل عمران: ۳۱)

اے پیغمبر ان لوگوں سے کہیے کہ اگر تم خدا سے محبت کرتے ہو تو میری اطاعت کرو۔ پھر خدا بھی تم سے محبت کرے گا۔

وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ○ (آل عمران: ۱۳۹)

اور اگر تم ایمان دار ثابت ہوتے تو تم ہی غالب رہو گے۔

اقبال نے گویا اس آیت کریمہ کا ترجمہ کر دیا ہے:

رہے گا تو ہی جہاں میں یگانہ و یکتا
اتر گیا جو ترے دل میں لا شریک لہٗ

اگرچہ یہ حقیقت زندگی کی خصوصیات اور ارتقائے عالم کی ضروریات سے صاف ظاہر ہے، تاہم قرآن حکیم نے خود بھی اس کا اعلان فرمایا ہے:

وَاِنْ تَتَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَكُمْ ثُمَّ لَا یَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ

(محمدؐ: ۳۸)

اور اگر تم خدا سے منہ پھیر لو گے تو وہ تمہاری جگہ اور قوم لے آئے گا اور پھر وہ تمہاری طرح نہیں ہوں گے

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَنْ یَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِیْنِهٖ فَسَوْفَ یَاْتِی اللّٰهُ بِقَوْمٍ یُّحِبُّهُمْ وَیُحِبُّوْنَهٗٓ اَذِلَّةٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اَعِزَّةٍ عَلَی الْكٰفِرِیْنَ یُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَلَا یَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ○ (المائدہ: ۵۴)

اے ایمان والو! اگر تم میں سے کوئی اپنے دین سے پھر جائے گا تو عنقریب خدا ایک ایسی قوم کو پیدا کر دے گا جو خدا سے محبت کرے گی اور جس سے خدا محبت کرے گا، وہ مومنوں کے لیے نرم اور کافروں کے لیے سخت ہوں گے۔ وہ اللہ کے راستہ میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے۔ یہ (تمہارا ایمان اور عمل خدا پر تمہارا احسان نہیں بلکہ تم پر) خدا کا فضل ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے اپنا فضل عطا کرتا ہے اور خدا کا علم وسیع ہے۔ (وہ خوب جانتا ہے کہ کون اس فضل کا حقدار ہے)۔

نقطۂ نظر

نظامِ اسلام کیا ہے؟

ذیل کا مضمون جو مدرسہ سراج العلوم لودھراں (ملتان) کے نوجوان عالم دین جناب سلیم بہادر ملکانوی کا تحریر کردہ ہے، ملک کے ایک معروف اہلِ قلم ڈاکٹر نصیر احمد ناصر کے ایک مضمون کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ اس مضمون کی اشاعت سے ہماری دلچسپی اسی قدر ہے کہ اس کے ذریعے اسلامی نظام کے بارے میں علماء کرام کا نقطۂ نظر کسی قدر وضاحت سے سامنے آتا ہے۔ (ادارہ)

اسلام کا نظام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ انسانی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں جس میں مذہب اسلام ہماری مکمل راہنمائی نہ کرتا ہو۔ آج کے اس سائنسی اور مادی دور میں معاشرۂ انسانی خواہ کتنی ہی ترقی کیوں نہ کر جائے اسلام کے ایسے ہمہ گیر اصول موجود ہیں جن کی روشنی میں ہم راہ یاب ہو سکتے ہیں اور خدائے بزرگ و برتر کی رضا حاصل کر سکتے ہیں۔

خدا رحمت کرے ان تمام حضرات پر جو اس دینِ کامل کے ہم تک پہنچنے کا ذریعہ و واسطہ بنے۔ جیسے جیسے نبی اُمّی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہونہار اور جاں نثار صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو تعلیم فرمائی اس کا تعلق زندگی کے جس شعبہ سے بھی تھا حضرات صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنھم نے من وعن آگے اپنے تلامذہ تک پہنچائی اور انہوں نے آگے اپنے اصحاب کو بیان فرمائی۔ یوں نظامِ اسلام سلسلہ وار ہم تک پہنچا اور اپنی اصلی شکل میں ہم میں آج بھی موجود ہے۔ اور ایسے ہی اسلام کا یہ ابدی نظام تا قیامت اپنی صحیح شکل و صورت کے ساتھ باقی رہے گا۔

اللہ تعالیٰ اپنے کلام مقدس میں ارشاد فرماتے ہیں:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ○

"ہم نے اس ذکر (قرآن) کو نازل کیا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں"

بخاری و مسلم شریف کی روایت ہے :

لا یزال من امتی امة قائمة قائمة بامر الله لا یضرهم من خذلهم ولا من خالفهم حتی یاتی امر الله وهم علی ذٰلك

"میری امت میں ایک طائفہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے دین پر قائم رہے گا۔ ان کو رسوا کرنے والے اور ان کی مخالفت کرنے والے ان کو نقصان نہیں پہنچا سکیں گے یہاں تک کہ قیامت واقع ہو اور وہ اسی دین پر ہوں گے۔"

بیہقی نے المدخل صـ۳۶ میں روایت نقل فرمائی ہے :

یحمل هذا العلم من کل خلف عدولهٗ ینفون عنهٗ تحریف الغالین وانتحال المبطلین و تاویل الجاهلین اوکما قالؐ

یہ علم اپنے بعد میں آنے والی نسل سے اپنے ایسے توازن پسند لوگ بھی رکھتا ہے جو انتہا پسندوں کی تحریف، انکار کرنے والوں کی خود ساختہ باتوں اور جاہلوں کی غلط تاویلات کو اس سے دُور کرتے ہیں۔

بخاری و مسلم کی روایت ہے :

لا یزال ناسٌ من امتی ظاهرین حتی یاتیهم امر الله وهم ظاهرون

"میری امت کے کچھ لوگ برابر غالب اور سربلند رہیں گے اور اللہ کے حکم (قیامت) کے آنے تک ان کی فتحیابی و سربلندی قائم رہے گی۔"

جامع ترمذی کی حدیث مبارکہ ہے :

لا تزال طائفة من امتی منصورین لا یضرهم من خذلهم حتی تقوم الساعة.

"میری امت میں ایک گروہ برابر کامیاب و بامراد رہے گا اور ان کا ساتھ نہ دینے والے ان کو کچھ نقصان نہ پہنچا سکیں گے اور یہ صورت حال قیامت تک برقرار رہیگی۔"

ان تصریحات کے بعد یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ نظام اسلام اپنے اصلی خدوخال کے ساتھ موجود ہے مگر فی زمانہ جدید فنی علوم سے بہرہ ور یار لوگوں نے اسلام کو کھیل کے میدان کا فٹ بال سمجھ لیا ہے۔ ہر جدید تعلیم یافتہ جب

اپنے متعلقہ شعبہ (DEPARTMENT) سے سبکدوش ہوتا ہے تو اسے اسلام کے متعلق من مانی تشریحات اور تاویلات کرنے کی سوجھتی ہے گویا یہ ان کی ذہنی تفریح ہے۔

یا تو ایسے لوگ اسلام کو اس وسیع انداز میں پیش کرتے ہیں، مزید برآں تنگ نظری کی آڑ لے کر ایسی گمراہ کن وسیع القلبی کا مظاہرہ کرتے ہیں کہ الامان والحفیظ: حلال و حرام کی تمیز باقی نہیں رہتی ہے۔ سب کچھ جائز کر دیتے ہیں۔ اور کچھ لوگ ایسے بھی موجود ہیں جو کتاب اللہ کی بعض آیات مبارکہ اور احادیث شریفہ سے غلط استدلال کر کے اسلام کے وسیع دائرہ کو اتنا تنگ کر دیتے ہیں کہ بعض دیگر آیات و احادیث مبارکہ بے معنیٰ ہو کر رہ جاتی ہیں۔ الغرض ان لوگوں نے اسلام کو جو ایک عالمگیر مذہب ہے بازیچۂ اطفال بنا رکھا ہے ؎

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

ایک نظریہ کو ذہن میں راسخ کر لیا جاتا ہے وہ کس طریق سے ان تک پہنچا اس کی ان لوگوں کو کوئی پرواہ نہیں ہوتی پھر اس مفروضہ مذعومہ نظریہ کو مدلل و مبرہن کرنے کے لیے قرآن مجید اور احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا سہارا ڈھونڈتے ہیں۔ آیات و احادیث کی من مانی تاویلات و تشریحات کرتے ہیں اور دین کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیتے ہیں بقول حضرت امام ابوالکلام آزاد مرحوم:

"ان کو اپنی گنبدِ دستار کی تعمیر کے لیے اینٹیں چاہئیں اگرچہ خانۂ شرع کی دیواریں توڑ کر بہم پہنچائی جاویں۔"

اہل کتاب کی طرح ان میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو جان بوجھ کر حق اور صحیح بات کو چھپا دیتے ہیں وَاِنَّ كَثِيرًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ۔ افسوس کہ یہی حال شبر بشبر اور ذراع بذراع آج کل کے جدید تعلیم یافتہ ذہنوں کا ہے۔ وھم یھودُ ھٰذہِ الامّت الا ماشاء اللہ۔

موجودہ دور میں ہمارے کالجز اور یونیورسٹیز میں جو اسلامیات اور دینیات پڑھائی جاتی ہے وہ مذہب اسلام کو مکمل طور پر سمجھنے کے لیے ناکافی ہے اور اس کے پڑھنے سے فقہ کے اصولوں (کتاب و سنت، اجماع، قیاس) سے انسان مسائل کا استنباط نہیں کر سکتا تا آنکہ وہ شخص باضابطہ طریقہ سے علوم عقلیہ و نقلیہ کا مطالعہ نہ کرے۔

حال ہی میں ایک کتابچہ بعنوان "نظام اسلام کیا ہے؟" شائع ہوا جسے امیر تحریک

رحمۃ للعالمین جناب ڈاکٹر نصیر احمد ناصر نے مرتب کیا ہے۔ انہوں نے اپنے اس کتابچہ کا آغاز کچھ اس طرح کیا ہے کہ :

"ہر نظام کی بنیاد کچھ اصولوں پر ہوتی ہے۔ پورے نظام کو سمجھنے کے لیے اس کے جملہ اصولوں کو سمجھنا اور ان پر ہمہ وقت نظر رکھنا لازم ہے۔ نظامِ اسلام کے بھی بنیادی اصول ہیں۔ چند اہم اصول درج ذیل ہیں:"

اس کے بعد مرتب موصوف اپنے اس کتابچہ میں نمبروار آیات کو اسلام کے اصول بنا کر درج کرتے گئے اور ان آیاتِ مبارکہ سے مسائل کا استنباط کرتے گئے۔ ہماری بحث اس وقت صرف اور صرف اس سے ہے کہ ان آیات مبارکہ سے جو مسائل مستنبط کئے گئے ہیں کیا وہ صحیح ہیں یا ان میں کچھ کلام کرنے کی گنجائش ہے؟

درحقیقت پورا کتابچہ محل نظر ہے۔ جناب ڈاکٹر صاحب کے ان آیات سے وضع کردہ اصول اور اس کے ذیل میں ہونے والی مفصل تشریح نظرِ ثانی کی محتاج ہے۔ تمام کا ذکر کرنا شروع کر دیں تو بہت طویل بحث شروع ہو جائے گی۔ اس بنا پر بطور "مُشتے نمونہ از خروارے" ایک اصول پر بحث کرتے ہیں۔ یہیں سے اندازہ ہو جائے گا کہ امیر ڈاکٹر صاحب کہاں تک اور کس درجہ قرآن حکیم کی حقیقت کو سمجھ پائے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو قرآن حکیم کی حقیقت کی سمجھ عطا فرمائے۔

امیر ڈاکٹر صاحب اپنے کتابچہ میں تیسرے نمبر پر بطور اصول یہ آیت مبارکہ درج فرماتے ہیں :-

وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ۝ وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى ۝ ثُمَّ يُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰى ۝

"اور یہ کہ آدمی کو وہی ملتا ہے جو اس نے کمایا اور اس کی یہ کمائی دکھلائی ضرور ہے پھر اس کو بدلہ ملتا ہے پورا بدلہ"

قبل اس کے کہ ہم ڈاکٹر صاحب کے ان آیات سے مستنبط کردہ مسائل کی صحت کا جائزہ لیں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان آیات مبارکہ کی حضرات مفسرین کے اقوال کی روشنی میں وضاحت کر دی جائے پھر ڈاکٹر صاحب کے مستنبطہ مسائل کا اصل کتابچہ کی عبارت میں

ذکر کریں گے تاکہ ناظرین یہ آسانی سے فیصلہ فرما دیں کہ ڈاکٹر صاحب کی تحقیق کہاں تک صحیح ہے!

شانِ نزول:

مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر "معارف القرآن" میں بحوالہ "درمنثور" یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک شخص اسلام لے آیا اس کے کسی دوست نے ملامت کی کہ تو نے اپنے باپ دادا کے دین کو کیوں چھوڑ دیا۔ اس شخص نے جواب دیا کہ میں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ دوست نے کہا کہ تو مجھے کچھ دیدے تو میں آخرت میں تیرا عذاب اپنے سر پہ رکھ لوں گا اور تو عذاب سے بچ جائے گا۔ چنانچہ اس نے کچھ دیدیا اس نے اور مانگا تو کچھ کشاکشی کے بعد اور بھی دے دیا اور بقیہ کی دستاویز مع گواہوں کے لکھ دی۔ جس شخص نے اسلام قبول کیا تھا تفسیر روح المعانی میں اس کا نام ولید بن مغیرہ لکھا ہے۔ اس موقع پہ اللہ تعالیٰ نے درج ذیل آیات نازل فرمائیں:

أَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ ○	"کہ اٹھاتا نہیں کوئی اٹھانے والا
وَأَن لَّيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا	بوجھ کسی دوسرے کا۔ اور یہ کہ آدمی کو وہی
مَا سَعَىٰ ○ وَأَنَّ سَعْيَهُ	ملتا ہے جو اس نے کمایا۔ اور یہ کہ اس کی
سَوْفَ يُرَىٰ ○ ثُمَّ يُجْزَاهُ	کمائی اس کو دکھلانی ضرور ہے۔ پھر
الْجَزَاءَ الْأَوْفَىٰ ○	اس کو بدلہ ملنا ہے اس کا پورا پورا"

پ ۲۷ رکوع ۷

مذکورہ بالا آیات میں سے پہلی آیت میں بوجھ سے مراد گناہ کا بوجھ ہے اور اس کا عذاب، کہ قیامت کے روز کسی ایک شخص کے گناہ دوسرے پہ نہیں لادے جائیں گے۔ بلکہ ہر شخص اپنے گناہوں کا بوجھ اور اس کا عذاب خود برداشت کرے گا۔ جیسا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ ایک دوسرے مقام پہ ارشاد فرماتے ہیں کہ گناہوں کے بوجھ سے لدا ہوا شخص لوگوں سے درخواست کرے گا کہ میرا کچھ بوجھ تم اٹھا لو تو کسی کی کیا مجال ہوگی کہ اس کے بوجھ کا کچھ حصہ اٹھا سکے۔

وَإِن تَدْعُ مُثْقَلَةٌ إِلَىٰ	اور اگر کوئی بوجھ والا اپنے بوجھ کی طرف
حِمْلِهَا لَا يُحْمَلْ مِنْهُ	بلائے تو اس کے بوجھ میں سے کچھ

نَشَیئٌ وَّلَوْکَانَ ذَاقُرْبٰی   بھی نہ اٹھایا جائے گا۔ اگرچہ قریبی رشتہ دار
پ۲۷ رکوع ۱۵   ہی ہو"۔

اللہ تعالیٰ نے آگے اسی مضمون کی تکمیل فرمادی کہ جس طرح کوئی شخص دوسرے کے گناہوں کا بوجھ اور اس کا عذاب قیامت کے دن نہیں اٹھاسکے گا بالکل ایسے ہی کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ دوسرے کے عمل کے بدلے خود عمل کرلے اور وہ اس عمل سے سبکدوش ہوجائے۔ بلکہ

وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّامَاسَعٰی۝

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ اسی آیت کے ذیل میں فرماتے ہیں کہ مثلاً ایک شخص دوسرے کی طرف سے نماز فرض ادا کردے یا دوسرے کی طرف سے فرض روزہ رکھ لے اور وہ دوسرا اپنے فرض نماز روزے سے سبکدوش ہوجائے یا یہ کہ ایک شخص دوسرے کی طرف سے ایمان قبول کرلے اور اس کو اس سے مومن قرار دے دیا جائے۔ وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَاسَعٰی کہ آدمی کو وہی کچھ ملے گا جو اس نے کمایا۔ کوئی کسی کا نائب بن کر دوسرے کو چھٹکارا نہیں دے سکتا۔

علامہ ابن کثیرؒ اسی آیت کے تحت فرماتے ہیں کہ :

لا یحصل من الاجر الا ماکسب ھو لنفسہ

اس کے بعد رئیس المفسرین امام ابن کثیرؒ امام شافعیؒ کا مسلک نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

ومن ھذہ الایۃ الکریمۃ استنبط الشافعی ان القراۃ لا یصل اھداء ثوابھا الی الموتیٰ لانہ لیس من عملھم ولا کسبھم

گویا امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا نظریہ بھی یہی ہے کہ اس آیت کریمہ کا تعلق کسی دنیوی معاملے سے نہیں بلکہ اس کا تعلق اُخروی زندگی سے ہے۔

قطب الارشاد فقیہ النفس رشید احمد گنگوہیؒ فرماتے ہیں کہ "لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی میں جو سعی ہے اس سے سعی ایمانی مراد ہے کہ ایک کا ایمان دوسرے کے کام نہیں آئے گا کہ یہ مومن بن جائے گا اور نجات اسے دے دی جائے۔ اس میں عمل کا

ذکر نہیں ہے یہ سعی ایمانی مراد ہے جو سعی قلبی ہے" مجالس حکیم الاسلام ص۸۲
اب آپ بخوبی جان چکے ہوں گے کہ ان آیات مبارکہ کا تعلق کسی دنیوی معاملہ سے نہیں بلکہ صرف اور صرف اس سے ہے کہ آخرت میں عند اللہ ہر ایک کا اپنا ایمان کام آئے گا۔ کسی اور کو دوسرے کے ایمان کا نفع نہ پہنچے گا۔ اتنی بات سمجھ لینے کے بعد اب غور فرماویں امیر ڈاکٹر صاحب کی اس عبارت پر جو انہوں نے ان آیاتِ مبارکہ کی تشریح میں بیان فرمائی ہے۔ فرماتے ہیں کہ :

"کسب و محنت کے بغیر انسان محض سرمائے کے بل پر پیداوار یا منافع میں حصہ لینے کا حق دار نہیں جو بھی اگر وہ خود کام نہیں کرتا محنت و مشقت نہیں کرتا اور محض خوابیدہ یا بیکار (SLEEPING) سرمایہ کار کی حیثیت سے پیداوار یا منافع میں حصہ لیتا ہے تو وہ سود لیتا ہے (بحوالہ قرآن و احادیث طیبہ) اور باطل طریقوں سے دوسروں کی کمائی کھاتا ہے اور مفت خوری درج ذیل آیۃ جلیلہ کی رو سے بھی حرام ہے : وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اور تم ایک دوسرے کا مال باطل طریقوں سے نہ کھاؤ"

اب غور فرماویں کہ محترم ڈاکٹر صاحب کا ان آیاتِ مبارکہ سے ایسی تشریح کرنا کہاں تک صحیح ہے۔

کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑہ ، بھان متی نے کنبہ جوڑا ! والی بات ہے۔ بالفرض اگر یہ آیات کسی دُنیوی معاملہ میں نازل ہوئی ہوتیں تو پھر بھی ڈاکٹر صاحب کو چاہیئے تھا کہ ان آیات مبارکہ سے ایسا مفہوم نکالتے کہ جس سے کسی اور حکم اسلامی پر زد نہ پڑتی۔ قرآن حکیم ایک ایسا بحر ذخار ہے جس کے نکات کبھی ختم ہونے کو نہیں۔ اسلامی اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے جتنے بھی مسائل اس سے مستنبط ہو سکیں گے ہوتے رہیں گے کیونکہ ہر آئندہ دور میں نئے نئے مسائل جنم لیں گے اور ہم مسلمانوں کا یہ اجماعی عقیدہ ہے کہ ہر نئے آنے والے مسئلہ کا حل قرآن حکیم میں موجود ہے۔

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِكُلِّ شَيْءٍ "اور ہم نے تجھ پر ایک ایسی کتاب نازل کی ہے جس میں ہر چیز کا کافی بیان ہے"

پ رکوع ۱۸

تب ہی تو اسلام کو دین کامل سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے :۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ — " آج میں تمہارے لیے تمہارا دین پورا کر
وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ — چکا اور میں نے تم پر اپنا احسان پورا کر دیا
رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا — اور میں نے تمہارے واسطے اسلام ہی کو
پ ۶ رکوع ۵ — دین پسند کیا۔"

قرآن حکیم کی آیات سے ایسے مسائل کا استنباط کرنا کہ جن کا ٹکراؤ اجماعی مسائل سے ہوتا ہو قطعاً اس لائق نہیں کہ اس کی طرف التفات کیا جائے۔ تو جناب ڈاکٹر صاحب کا یہ کہنا کہ

"کسب و محنت کے بغیر محض سرمائے کے بل پر پیداوار یا منافع میں حصہ لینے کا حق دار نہیں"

ہرگز صحیح نہیں ہے۔

دراصل محترم ڈاکٹر صاحب دبے لفظوں میں بیع مضاربہ جیسے اجماعی مسائل کا انکار فرما رہے ہیں۔ بیع مضاربہ کی تعریف کے بارے میں علامہ بدرالدین عینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

وفی الشرع عبارۃ عن عقد — شریعت میں (مضاربۃ) دو آدمیوں
بین اثنین یکون من احدھما — کے درمیان ایک ایسے عقد کا نام ہے کہ
المال ومن الآخر التجارۃ فیہ — ان میں سے ایک کا مال ہو اور دوسرے
ویکون الربح بینھما۔ — کا عمل اور نفع دونوں میں مشترک ہو۔

ناظرین اس بات کا اب بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ حکم اسلامی بیع مضاربہ کی تعریف میں اور محترم ڈاکٹر صاحب کے آیت "وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی" کے مطلب میں کیا فرق ہے۔ قرآن و حدیث سے مستنبط مسئلہ سے سرمو انحراف جائز نہیں چہ جائیکہ کلی طور پر اس سے روگردانی کی جائے۔ قرآن حکیم میں بیع مضاربہ کے بارے میں ارشاد گرامی ہے :

وَاٰخَرُوْنَ یَضْرِبُوْنَ فِی الْاَرْضِ — " اور ایک جماعت ہے جو زمین میں چل پھر
یَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ — کر اللہ کے رزق کو تلاش کرتی ہے"۔

یعنی صاحب مال تو مال لگاتے ہیں اور محنت والے اس کے ذریعے سے ملکوں اور شہروں میں تجارت کرتے ہیں۔ تقریباً سیرت مبارکہ کی تمام کتابوں میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر نامۂ شام کا تذکرہ موجود ہے۔

نبوت سے قبل آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاتونِ اوّل حضرت خدیجۃ الکبریٰ کا مال لے کر بصریٰ (شام) کی منڈی میں تشریف لے گئے۔ اس سفر میں حضرت خدیجہؓ کا غلام میسرہؓ بھی آپؐ کے ساتھ تھا اور آپؐ کی اس معاملہ میں راست بازی ہی کو دیکھ کر حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا نے اسلام کی عظیم ترین دولت کو اپنے سینے سے لگایا اور ایمان سے مشرف ہوئیں۔ حضرت مولانا حفظ الرحمان صاحب سیوہارویؒ فرماتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت سے قبل بصریٰ (شام) کی منڈی میں حضرت خدیجۃ الکبریٰ کے مال میں تجارت اصولِ مضاربہ پہ ہی کی تھی جو بیش از بیش نفع کی شکل میں انجام پائی۔
(اسلام کا اقتصادی نظام ص۳۳۶)

اب آپ حضرات نے اندازہ لگایا ہوگا کہ ڈاکٹر صاحب کا مستنبطہ مسئلہ صحت کے ساتھ کہاں تک تعلق رکھتا ہے۔ علاوہ ازیں فقہ کی مشہور کتاب "سعیدیات" میں ہے کہ مضاربہ لوگوں کی ضروریات کے لیے جائز رکھی گئی ہے اس لیے کہ بعض مال دار کاروبار سے ناواقف و نابلد ہوتے ہیں اور بعض غریب کاروبار کے ماہر ہوتے ہیں اور مصالح تجارت سے خوب واقف ہوتے ہیں۔ نیز نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل یہ طریق تجارت جاری تھا۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بہتر سمجھ کر جاری رکھا اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی شرائط مضاربہ کو پسند فرمایا۔ (اقتصادی نظام ص۳۲۷)

امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ اپنی مشہور زمانہ کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں فرماتے ہیں کہ:

"معاونت باہمی کی چند قسمیں ہیں ایک ان میں سے مضاربہ بھی ہے۔"

آگے چل کر حضرت شاہ صاحبؒ اسی عقد مضاربہ کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"وہ یہ کہ مال ایک شخص کا ہو اور محنت دوسرے شخص کی اور رضامندی طرفین کی تصریح کے ساتھ نفع دونوں کے درمیان میں ہو۔"

(حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص۱۱۶)

حضرت مولانا حفظ الرحمان صاحب سیوہارویؒ مضاربہ کا عنوان باندھ کر فرماتے ہیں کہ:

"امداد باہمی کے مقاصد کو پورا کرنے کے لیے یہ (مضاربہ) بہترین طریق تجارت ہے مضاربہ ایسے تجارتی معاملہ کا نام ہے جس میں ایک جانب راس المال (سرمایہ) ہوتا ہے اور دوسری جانب فقط محنت ہوتی ہے اور منافع مثلاً نصف نصف یا اور کم وبیش طے پاجاتا ہے" (اقتصادی نظام ص۳۲۵)

آگے چل کر مولانا موصوف علیہ الرحمۃ اسی بحث کو ان الفاظ پر ختم فرماتے ہیں:

"گویا اس شکل میں سرمایہ دار کا سرمایہ "لعنت" نہیں بلکہ رحمت بن جائے گا اور نادار کی محنت اور کاروباری ہوش مندی اور استعداد ضائع اور رائیگاں ہونے کے بجائے کارآمد اور نفع بخش ثابت ہوگی"

آگے فرماتے ہیں کہ:

"نتیجہ یہ نکلے گا کہ نہ سرمایہ کنز بن کر احتکار اور اکتناز کا باعث ہوگا اور نہ اصحاب ضرورت کی انسداد ضروریات پر قفل پڑ سکیگا اور جماعتی زندگی میں نہ فاقہ کش نظر آئیں گے اور نہ قابل نفرت سرمایہ دار"

آخری گذارش

اسلام ایک دین فطرت ہے۔ جن وانس کی خیر وفلاح کے لیے نازل کیا گیا ہے۔ دین اسلام کو نازل کرنے والی ذات خدائے حکیم وعلیم ہے اس ذات برتر نے کوئی ایسا حکم نازل نہیں کیا جس پر عمل مشکل ہو اور جس کے سمجھنے کے لیے عقل انسانی قاصر ہو۔

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا

مگر شرط یہ ہے کہ اہلیت اور لیاقت بھی ہو کہ انسان کو پہلے اپنے اندر اتنی استعداد پیدا کرلینی چاہیئے کہ جس سے مسائل کا استخراج ہو سکے ورنہ دین وملت پر ظلم کرنے کے علاوہ خود اپنے پر بھی ظلم ہوگا۔

تو خاک میں مل اور آگ میں جل جب خشت بنے تب کام چلے
ان خام دلوں کے عنصر پہ بنیاد نہ رکھ تعمیر نہ کر

میرا عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ جب تک کسی ماہر دین سے علاقہ نہ ہو اپنے طور پر اس وقت تک دین اسلام کی کوئی قابل قدر خدمت انجام نہیں دی جاسکتی۔ اپنی مدد آپ کے تحت

کی کوششیں اس میدان میں بارآور نہیں ہوسکتی۔ منبع علوم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں بعض صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو بھی غلط فہمی ہوگئی تھی کہ آیت "حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَکُمُ الْخَیْطُ الْاَبْیَضُ مِنَ الْخَیْطِ الْاَسْوَدِ" کے مطلب میں خطا کھا بیٹھے کہ انہوں نے اپنے پاس سفید و سیاہ دھاگے رکھ لیے تھے۔ علاوہ ازیں اگر فہم دین میں اتنی ہی آسانی تھی تو پھر علماءِ امت اور حاملینِ دینِ متین کی اتنی فضیلت کیوں؟

فَاسْئَلُوْا اَھْلَ الذِّکْرِ اِنْ کُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ○

اَلْعُلَمَاءُ وَرَثَۃُ الْاَنْبِیَاءِ

عُلَمَاءُ اُمَّتِیْ کَاَنْبِیَاءِ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ

اس تمام بحث سے معلوم ہوا کہ حصول علم کے لیے جب تک کسی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ نہ کیا جاوے تو اس وقت تک علم دین سے مکمل روشناسی ناممکن بلکہ محال ہے۔

آغوشِ صدف جس کے نصیبوں میں نہیں ہے
وہ قطرہ نیساں کبھی بنتا نہیں گوہر

اپنی خام معلومات پر اجتہاد کی بنیاد رکھنا دانش مندی نہیں بلکہ ضلالت و گمراہی ہے۔ اجتہاد کا لفظ تو آسان ہے مگر حقیقتِ اجتہاد تک رسائی بہت مشکل ہے۔ حقیقتاً اجتہاد کے مرتبہ پر کون فائز المرام ہوسکتا ہے اس بارے میں پاک و ہند کے نامور عالم دین مولانا منظور احمد نعمانی اپنی کتاب "دین و شریعت" میں اس عنوان کے تحت کہ "اجتہاد کا حق کس کو حاصل ہے" میں فرماتے ہیں:

"اجتہاد کے سلسلہ میں ایک بات یاد رکھنی چاہیئے کہ یہ ہر ایک کا کام نہیں، جن بزرگوں نے یہ کام کیا ان کا کتاب و سنت کا علم نہایت ہی وسیع تھا۔ انہوں نے ان لوگوں کو دیکھا تھا بلکہ ان ہی سے علم دین حاصل کیا تھا جنہوں نے دینی تعلیم و تربیت براہ راست صحابہ کرامؓ یا ان کے خاص شاگردوں سے حاصل کی تھی پھر اس مستند اور وسیع علم اور اس تعلیم و تربیت کے علاوہ ان میں تعلق باللہ اور تقویٰ اعلیٰ درجہ کا تھا۔ دراصل یہ کام انہی کا تھا جن سے اللہ تعالیٰ نے لیا۔" (ص ۸۴)

اس کے بعد مولانا موصوف دامت برکاتہم "نئی روشنی کے بے علم مجتہد" کا عنوان باندھ کر فرماتے ہیں۔

"لیکن آج اجتہاد کو ایسی معمولی بات سمجھ لیا گیا کہ بعض لوگ دین کے متعلق اردو کے چند

رسالے پڑھ کر یا زیادہ سے زیادہ قرآن وحدیث کے چھپے ہوئے ترجمے کو دیکھ کر اپنے کو اجتہاد کا حق دار سمجھنے لگتے ہیں اور مسائل میں بالکل مجتہدانہ انداز میں رائے زنی کرنے لگتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں حدیث شریف میں آیا ہے :

ضَلُّوا وَ اَضَلُّوا خود بھی گمراہ ہیں اور دوسروں کو گمراہ کرتے ہیں۔" (ص۸۴)

حقیقت یہ ہے کہ امت میں جس نے بھی قرآن حکیم کا حدیثِ نبوی، اجماعِ امت اور اسلاف امت کی تحقیقات سے بے نیاز ہو کر آزاد مطالعہ کیا تو سوائے ضلالت و گمراہی کی وادی میں بھٹکنے کے قرآن پاک کی کوئی خدمت نہیں کی بلکہ ان راہوں میں جو اشاعتِ اسلام کے لیے ممد و معاون ہیں مزید ایک روڑے کا اضافہ کیا۔ ایسے اقدام سے صرف یہی نہیں کہ خود نام نہاد مفکرِ اسلام جادۂ حق سے ہٹ گئے بلکہ دوسروں کی گمراہی کا ذریعہ بنتے ہیں تو کیا " ضَلُّوا وَ اَضَلُّوا " والی حدیث کا مصداق نہ بنے۔ لہٰذا آخر میں جناب ڈاکٹر نصیر احمد ناصر سے ایک عالم دین کے الفاظ میں عرض کروں گا کہ :

" میں نہیں کہہ سکتا کہ " مرتب " اس قسم کی غلطیاں کم علمی سے کر رہے ہیں یا کسی خاص مقصد سے وہ ایسا کر رہے ہیں بہر حال ان کی سعی بے قابلِ افسوس "

گو نالہ نارسا ہو نہ ہو آہ میں اثر
میں نے تو درگذر نہ کی جو مجھ سے ہو سکا

اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ عَلَیْہِ تَوَکَّلْتُ وَاِلَیْہِ اُنِیْبُ

●

محترم قارئین

بعض وجوہ کی بنا پر چند ایک خریداری نمبر تبدیل کرنے پڑے ہیں۔ براہِ کرم اپنا نیا خریداری نمبر نوٹ فرمالیجئے گا جو لفافے پر درج ہے۔ زرِ تعاون کے لیے یاد دہانی کے باوجود جن حضرات کی طرف سے اطلاع موصول نہیں ہوئی، اُن کے نام پرچہ بدستور جاری رکھنے سے قاصر ہوں گے۔ شکریہ

ناظم سرکولیشن

سورۃ البقرۃ (۱۴)

ملاحظہ: کتاب میں حوالہ کے لیے قطعہ بندی (پیراگرافنگ) میں بنیادی طور پر تین ارقام (نمبر) اختیار کیے گئے ہیں۔ سب سے پہلا (دائیں طرف والا) ہندسہ سورۃ کا نمبر شمار ظاہر کرتا ہے۔ اس سے اگلا (درمیانی) ہندسہ اس سورۃ کا قطعہ نمبر (جو زیر مطالعہ ہے اور جو کم از کم ایک آیت پر مشتمل ہوتا ہے) ظاہر کرتا ہے۔ اس کے بعد والا (تیسرا) ہندسہ کتاب کے مباحثِ اربعہ (اللغۃ، الاعراب، الرسم اور الضبط) میں سے زیرِ مطالعہ مبحث کو ظاہر کرتا ہے یعنی علی الترتیب اللغۃ کے لیے ۱، الاعراب کے لیے ۲، الرسم کے لیے ۳ اور الضبط کے لیے ۴ کا ہندسہ لکھا گیا ہے۔ بحث اللغۃ میں چونکہ متعدد کلمات زیرِ بحث آتے ہیں اس لیے یہاں حوالہ کی مزید آسانی کے لیے نمبر کے بعد قوسین (بریکٹ) میں متعلقہ کلمہ کا ترتیبی نمبر بھی دیا جاتا ہے۔ مثلاً ۲: ۵: ۱ (۳) کا مطلب ہے سورۃ البقرۃ کے پانچویں قطعہ میں بحث اللغۃ کا تیسرا لفظ اور ۲: ۵: ۳ کا مطلب ہے سورۃ البقرۃ کے پانچویں قطعہ میں بحث الرسم۔ وھکذا۔

۱۴ اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيْهِ
ظُلُمٰتٌ وَّ رَعْدٌ وَّ بَرْقٌ
يَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ
مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ۔
وَاللّٰهُ مُحِيْطٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ۝

یا HEAVEN کے ہم معنی ہے۔ تاہم عربی میں بارش اور بادل کو بھی "سماء" کہتے ہیں۔ اور اضافت کے ساتھ اس کے معنی چھت (سقف) کے بھی ہوتے ہیں مثلاً "سماء البیت" کے معنی "گھر کی چھت" ہی ہیں۔ لفظ "سماء" عربی زبان میں زیادہ تر مؤنث مگر کبھی کبھار مذکر کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس کی جمع زیادہ تر جمع مؤنث سالم کی طرح "سماوات" ہی آتی ہے۔ یہ لفظ (سماء) قرآن کریم میں، زیادہ تر معرف باللام (السماء) ہو کر کل ۱۲۰ جگہ آیا ہے جس میں سے صرف ایک جگہ (المزمل: ۱۸) یہ مذکر استعمال ہوا ہے۔

[فِيهِ] جو "فِيْ" (حرف الجر) + ہٖ (ضمیر مجرور برائے واحد غائب مذکر) ہے اس کا اردو ترجمہ یہاں "جس میں" ہوگا۔ "فیہ" کے بارے میں مفصل بات البقرہ: ۲ کے ضمن میں [۲:۱:۱ (۵) میں] ہو چکی ہے۔

[ظُلُمَاتٌ] (یہ اس لفظ کا رسم املائی ہے رسم قرآنی پر "الرسم" میں بات ہوگی) اس لفظ کا مفرد (واحد) "ظُلْمَةٌ" ہے جس کا مادہ "ظ ل م" اور وزن "فُعْلَةٌ" ہے۔ اس مادہ سے فعل ثلاثی مجرد کے استعمال بلکہ خود لفظ "ظلمات" کے اشتقاق، معنی اور اس کے قرآنی استعمال پر البقرہ: ۱۷ [۲:۱۳:۱ (۹)] میں بات ہو چکی ہے۔

۲:۱۴:۱ (۴) [وَرَعْدٌ] کی "و" تو عاطفہ (بمعنیٰ "اور") ہے۔ اور لفظ "رَعْدٌ" کا مادہ "ر ع د" اور وزن "فَعْلٌ" ہے۔ اس مادہ سے فعل ثلاثی مجرد "رَعَدَ یَرْعُدُ" اور "رَعِدَ یَرْعَدُ رَعْدًا" (باب نصر اور سمع سے) آتا ہے اور اس کے بنیادی حقیقی معنی "(بادل کا) گرجنا" ہیں۔ پھر اردو کے "گرجنا" کی طرح عربی میں بھی اس کے کئی بامحاورہ استعمال ہوتے ہیں (مثلاً "ڈرانا، دھمکانا" وغیرہ)۔ تاہم قرآن کریم میں اس مادہ سے کسی قسم کے فعل کا کوئی صیغہ استعمال نہیں ہوا۔ لفظ "رَعْدٌ" جو دراصل مصدر ہے، کے دو معنی ہیں "گرجنا" اور "گرج (کی آواز)"۔ قرآن کریم میں یہ لفظ صرف دو جگہ اور وہ بھی دوسرے معنی (گرج) کے لیے آیا ہے۔ ایک یہاں (البقرہ: ۱۹) بصورت نکرہ اور دوسری جگہ (الرعد: ۱۳) بصورت معرفہ (الرعد) وارد ہوا ہے۔ بیشتر مترجمین نے اس

کا ترجمہ "گرج" ہی کیا ہے بعض نے "راعد" ہی رہنے دیا ہے جسے پڑھے لکھے لوگ سمجھ سکتے ہیں اور بعض نے خطوط وحدانی کے ساتھ بعض الفاظ کے اضافہ کے ترجمہ کیا ہے یعنی "اور (بادل) گرج (رہا ہو)" کی صورت میں۔ جسے تفسیری ترجمہ کہہ سکتے ہیں۔

۲:۱۴:۱ (۵) [وَبَرْقٌ] کی "وَ" بھی عاطفہ ہے۔ اور "برق" کا مادہ "ب ر ق" اور وزن "فَعْلٌ" ہے۔ اس مادہ سے فعل ثلاثی مجرد زیادہ تر تو "بَرَقَ یَبْرُقُ بَرْقًا" (باب نصر سے) آتا ہے اور اس کے بنیادی معنی "آسمان میں بجلی کا چمکنا" ہیں مثلاً کہتے ہیں "بَرَقَ الْبَرْقُ" (بجلی کوندی) یا "بَرَقَ السماءُ" (آسمان میں بجلی کی چمک ظاہر ہوئی)۔ اردو کے مصدر "چمکنا" کی طرح عربی میں بھی یہ فعل بطور محاورہ "چمکنا دمکنا"، "سنورنا" اور "بننا ٹھننا" کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ تاہم قرآن کریم میں اس باب سے اور ان معنوں کے لیے اس فعل کا کوئی صیغہ کہیں استعمال نہیں ہوا۔ البتہ مصدر آیا ہے۔

● البتہ اسی مادہ سے فعل مجرد "بَرِقَ یَبْرَقُ بَرَقًا (باب سمع سے) "دہشت زدہ ہونا" کے معنوں میں آتا ہے۔ اور اس باب سے (اور ان معنوں میں) فعل ماضی کا صرف ایک صیغہ (بَرِقَ) قرآن کریم میں بھی (صرف) ایک جگہ (القیامہ: ۷) وارد ہوا ہے۔

● کلمہ "بَرْقٌ" اس مادہ سے باب نصر کے فعل کا مصدر ہے اور اس کے معنی "چمکنا" بھی ہو سکتے ہیں اور "(بجلی کی) چمک" بھی۔ ان دونوں معنی کے لحاظ سے اس کا تعلق بنیادی طور پر "آسمانی بجلی" سے ہے۔ قرآن کریم میں یہ لفظ (بَرْقٌ) مفرد مرکب معرفہ نکرہ مختلف صورتوں میں کل پانچ جگہ وارد ہوا ہے۔

۲:۱۴:۱ (۶) [یَجْعَلُوْنَ] کا مادہ "ج ع ل" اور وزن "یَفْعَلُوْنَ" ہے۔ یعنی یہ فعل مضارع معروف کا صیغہ جمع مذکر غائب ہے۔ اس مادہ (جعل) سے فعل ثلاثی مجرد عموماً "جَعَلَ..... یَجْعَلُ جَعْلًا" (باب فتح سے) آتا ہے اور

اس کے متعدد معنی ہیں ۔مثلاً : (۱)....کو پیدا کرنا (۲)....کو بنانا (۳)....کو بنا ڈالنا (۴)....کو مقرر کرنا (۵)....کو تیار کرنا (۶)....کو ڈالنا ، ڈال لینا یا دے لینا (۷)....کو عطا کرنا (۸)....کو خیال کرنا ، سمجھ بیٹھنا (۹)....کو برابر ٹھیرانا (۱۰)....سے کوئی کام کروانا (۱۱) (کسی فعل کو) شروع کرنا وغیرہ ۔ان (مذکورہ بالا) میں سے اکثر معنوں کے لیے یہ دو مفعول کے ساتھ آتا ہے جیسے ...کو... بنا دیا اور دونوں مفعول بنفسہٖ (منصوب) آتے ہیں ۔تاہم کبھی یہ صرف ایک مفعول کے ساتھ ہی آتا ہے ۔مثلاً "پیدا کرنا" یا "ڈالنا" کی صورت میں ۔عنا اور ع۱۱ والے معنوں کی صورت میں یہ کسی دوسرے فعل کے مضارع کے ساتھ استعمال ہوتا ہے ۔اور اس استعمال کے کچھ خاص قواعد ہیں۔

● یہ فعل (جعَل) قرآن کریم میں بکثرت اور مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے مثلاً یہاں (زیر مطالعہ آیت میں) یہ فعل "ڈالنا ، ڈال لینا ، دے لینا" کے معنی میں آیا ہے ۔جس کا بامحاورہ اردو ترجمہ بعض نے "ٹھونس لینا" سے کیا ہے ۔قرآن کریم میں اس مادہ (جعل) سے فعل ثلاثی مجرد کے مختلف صیغے ۳۴۵ جگہ اور بعض مشتقات ۱۱ جگہ آئے ہیں ۔

__۲:۱۴:۱(۷)__ [اَصَابِعَهُمْ] میں آخری "ھم" تو ضمیر مجرور بمعنیٰ "ان کا/کی" ہے اور لفظ "اَصَابِعَ" (جو یہاں منصوب ہے) کا مادہ "ص ب ع" اور وزن "اَفَاعِلُ" (غیر منصرف) ہے ۔"اَصَابِع" کا واحد "اِصْبَعٌ" ہے جو ابتدائی ھمزہ (ا) اور "ب" کی مختلف حرکات کے ساتھ چھ سات مختلف طریقوں سے بولا جاتا ہے تاہم اس کی زیادہ مستعمل اور لہٰذا زیادہ صحیح صورتیں دو ہی ہیں "اِصْبَعٌ" اور "اِصبِعٌ" (دونوں طرح) ہیں ۔اور اس کے معنی "ہاتھ یا پاؤں کی انگلی" ہیں — عربی زبان میں یہ لفظ (اصبع) زیادہ تر مؤنث اور کبھی کبھار مذکر بھی استعمال ہوتا ہے ۔

● اس مادہ (صبع) سے فعل ثلاثی مجرد "صَبَع یصبَع صبعًا" (باب فتح سے) بغیر صلہ کے (صبعَہٗ) "کسی کو متکبر بنا دینا" یا "تکبر پر اکسانا" کے معنی دیتا ہے ۔

اور (زیادہ تر) " علی " یا " باء (ب) " کے صلہ کے ساتھ (یعنی صبع علیہ و بہ) "کسی کی طرف انگلی سے اشارہ کرنا" یا " انگلی کے اشارے سے رہنمائی کرنا " کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ تاہم قرآن کریم میں اس مادہ سے فعل کا کوئی صیغہ کہیں استعمال نہیں ہوا۔ بلکہ صرف یہی کلمہ " اصابع " (بصورت جمع) ہی صرف دو جگہ (البقرہ : ۱۹ اور نوح : ۷) میں وارد ہوا ہے۔

۲:۱۴:۱ (۸) [فِیْٓ اٰذَانِهِمْ] جو فی + آذان + هم کا مرکب ہے۔ " فِی " اور " هم " کے معنی پہلے کئی جگہ بیان ہو چکے ہیں۔ کلمہ " آذان " کا مادہ " أذن " اور وزن " أفعالٌ " ہے۔ اس کی اصلی شکل " أَأْذَانٌ " تھی جس میں همزۂ متحرکہ و ساکنہ کے جمع ہونے کی بنا پر " أأ " کو (وجوباً) " آ " بنا لیا جاتا ہے (اس کے قرآنی ضبط پر بعد میں بات ہو گی)۔ اس لفظ (آذان) کا واحد (مفرد) " أُذُنٌ " (بروزن " فُعُلٌ ") ہے جس کے معنی " کان " (سننے والا عضو) ہیں اور یہ لفظ (اُذُن) عربی میں ہمیشہ بطور مؤنث استعمال ہوتا ہے۔

اس مادہ (اذن) سے فعل ثلاثی مجرد " أَذِنَ يَأْذَنُ إِذْنًا " (باب سمع سے) مختلف صلات کے ساتھ مختلف معنوں کے لیے استعمال ہوتا ہے مثلاً (۱) أَذِنَ بِ .... (.... (کسی بات) کو جان لینا) (۲) أَذِنَ إلیہ (کسی کی بات پر کان دھرنا یا توجہ سے سننا) (۳) أَذِنَ لہ (کسی کو اجازت دینا) اور (۴) اذِنَ عَلَیہ (کسی سے اندر آنے کی اجازت مانگنا) وغیرہ۔ ان میں سے قرآن کریم میں یہ فعل صرف ع۱ اور ع۳ والے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ قرآن کریم میں اس مادہ (اذن) سے فعل مجرد کے مختلف صیغے ۲۳ جگہ اور مزید فیہ کے ابواب تفعیل، تفعّل، افعال اور استفعال کے کچھ صیغے ۱۹ جگہ اور جامد و مشتق اسماء کے بعض صیغے ۵۹ جگہ آئے ہیں جن میں سے لفظ " اُذن " (واحد) پانچ دفعہ اور " آذان " (جمع) گیارہ دفعہ آئے ہیں۔

۲:۱۴:۱ (۹) [مِنَ الصَّوَاعِقِ] یہ مِنْ + الصواعق کا مرکب جاری ہے۔ " مِنْ " کے معنی و استعمال پر البقرہ : ۳ [۲:۲:۱ (۵)] میں بات گزر چکی ہے۔

"الصواعق" (جو معرف باللام اور مجرور ہے) کا مادہ "ص ع ق" اور وزن (لام تعریف کے بغیر) "فَواعِلُ" ہے جو شبہ "مَفَاعِلُ" ہے[1] اور منتہی الجموع ہونے کے باعث غیر منصرف بھی ہے۔ اور اس لفظ (صواعق) کا واحد (مفرد) "صاعِقَةٌ" ہے۔ جس کے ایک معنی ہیں "آسمانی (گرنے والی) بجلی" یعنی (LIGHTNING) یا اس (بجلی) کی کڑک (THUNDERBOLT)۔

● اس مادہ (صعق) سے فعل ثلاثی مجرد مختلف ابواب سے مختلف معنی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً (۱) صَعَق یَصعَق صعقًا (باب فتح سے) کے ایک معنی "آسمان کا کسی پر بجلی گرانا یا بجلی کا کسی پر گرنا" ہیں۔ یہ فعل بطور متعدی مگر بغیر کسی صلہ کے آتا ہے مثلاً کہیں گے "صَعَقَتْهُ السماءُ او الصاعِقَةُ" یعنی آسمان (السماء) یا بجلی (الصاعقة) نے اس کو "بجلی زدہ" کر دیا اور اسی فعل سے جدید استعمال ہے "صَعَق التيارُ الكهربائيُّ الرجلَ = اس (آدمی) کو (انسانی تیار کردہ) بجلی نے جھٹکا دیا۔ (۲) اور "صعِق یَصعَق صَعَقًا" (باب سمع سے) کے ایک معنی "بجلی کا کڑک کی (یا کسی جانور کا خوفناک) آواز نکالنا" ہوتے ہیں اور (۳) اسی باب (سمع) سے بصیغہ معروف بطور فعل لازم "صعِقَ" یا بصیغۂ مجہول "صُعِقَ" (دونوں طرح) مگر مصدر "صَعْقًا" (بسکون عین) کے ساتھ آئے تو اس کے معنی ہوتے ہیں: "کسی خوفناک آواز سے بے ہوش ہو جانا یا مر جانا"۔ قرآن کریم میں یہ فعل (مجرد) مندرجہ بالا پہلے دو معنی (۱ و ۲) میں کہیں استعمال نہیں ہوا۔ البتہ صرف آخری (تیسرے[3]) معنوں کے لیے قرآن کریم میں اس فعل کے (باب سمع سے) ماضی معروف کا ایک ہی صیغہ (الزمر : ۶۸) اور مضارع مجہول کا بھی صرف ایک صیغہ (الطور : ۴۵) استعمال ہوا ہے۔ اس طرح بے ہوش ہونے والے کو "صَعِقٌ" (فرِحٌ کی طرح) کہتے ہیں۔ یہ لفظ بھی قرآن کریم میں صرف ایک جگہ (الاعراف : ۱۴۳) آیا ہے۔

● لفظ "صاعِقَةٌ" (جو زیر مطالعہ لفظ "الصواعق" کا مفرد نکرہ ہے)

---

[1] البقرہ : ۱۴ [۲ : ۱۱ : ۱ (۳)] میں اس کی وضاحت گزر چکی ہے۔

مندرجہ بالا پہلے معنی (ع۱) کے لحاظ سے مصدر بمعنی "بجلی گرنا" بھی ہے۔ اور خود اس گرنے والی بجلی کو بھی "صاعِقَة" کہتے ہیں۔ یہ لفظ (صاعقة) بھی معرفہ نکرہ مفرد مرکب مختلف صورتوں میں قرآن کریم کے اندر چھ دفعہ آیا ہے۔ اور اس کی جمع "الصواعق" قرآن کریم میں صرف دو دفعہ استعمال ہوئی ہے۔ ایک یہاں (زیر مطالعہ آیت میں) اور دوسرے (الرعد: ۱۳) میں۔

۲:۱۴:۱ (۱۰) [حَذَرَ الْمَوْتِ] یہ ایک مرکب اضافی ہے جو "حذر" (مضاف) اور "الموت" (مضاف الیہ) پر مشتمل ہے۔ دونوں کی لغوی تفصیل یوں ہے۔ "حَذَرُ" (جس کی "ر" کی حرکت فتحہ (ـَ) پر "الاعراب" میں بحث ہوگی) کا مادہ "ح ذ ر" اور وزن "فَعَلٌ" ہے۔ اس مادہ سے فعل ثلاثی مجرد "حذِر ... یحذَر حِذرًا وَحَذَرًا" (باب سمع سے) بطور فعل متعدی براہِ راست مفعول بنفسہ کے ساتھ بھی اور "مِنْ" کے صلہ کے ساتھ بھی استعمال ہوتا ہے۔ یعنی "حَذِرَہٗ و حذِر مِنْہ" دونوں طرح درست ہے اور اس کے معنی ہیں: "..... سے بچ کر رہنا"، "..... سے بہت محتاط ہونا یا ..... کے بارے میں احتیاط برتنا"، "..... سے ہوشیار رہنا" وغیرہ۔

بعض دفعہ اس فعل (حذِر) کا مفعول محذوف (غیر مذکور) ہوتا ہے۔ اس وقت اس کا ترجمہ فعل لازم کی طرح "محتاط رہنا" یا "خبردار رہنا" سے بھی کیا جا سکتا ہے۔ قرآن کریم میں اس فعل سے، اپنے مفعول کے ذکر کے ساتھ بھی اور اس کے بغیر بھی، صرف مضارع اور امر کے مختلف صیغے کل ۱۲ جگہ آئے ہیں۔ قرآن کریم میں اس فعل سے ماضی کا کوئی صیغہ نہیں آیا اور "مِن" کے صلہ کے ساتھ بھی یہ فعل قرآن کریم میں استعمال نہیں ہوا۔ فعل ثلاثی مجرد کے علاوہ اس مادہ (حذر) سے بعض اسماء مشتقہ اور مصدر پانچ جگہ اور اس مادہ سے باب تفعیل کا فعل مضارع بھی دو جگہ استعمال ہوا ہے۔ زیر مطالعہ لفظ (حذَر) اس کے فعل ثلاثی مجرد کا مصدر ہے جس کا ترجمہ "ڈر"، "اندیشہ" یا "خوف" سے کیا جا سکتا ہے۔

● اس (مندرجہ بالا) ترکیب کے دوسرے لفظ " الموت " کا مادہ " م وت" اور وزن (لام تعریف نکال کر) "فَعْلٌ" ہے (ترکیب میں یہ لفظ بوجہ اضافت مجرور آیا ہے)۔ اس مادہ سے فعل ثلاثی مجرد " ماتَ یمُوتُ مَوْتًا " (باب نصر سے اور دراصل مَوَتَ یَمْوُتُ) اور کبھی " ماتَ یَمَاتُ موتًا " (باب سمع سے اور دراصل موت یَمُوْتُ) آتا ہے اور اس کے مشہور اور بنیادی معنی " مرنا، مرجانا، جسم سے روح کا نکل جانا " ہیں۔ اور اس فعل کے عربی زبان میں مختلف محاوراتی استعمالات (مثلاً " زمین کا بے آباد ہونا، ہوا کا رک جانا، راکھ میں چنگاری تک کا ختم ہوجانا، کپڑے کا بوسیدہ ہونا، راستے کا متروک ہوجانا وغیرہ) کی بنیاد یہی معنی ہیں۔

● لفظ " مَوْت " جو دراصل فعل ثلاثی مجرد کا مصدر ہے، اردو بلکہ فارسی پنجابی وغیرہ کئی اسلامی زبانوں میں اپنے اصل عربی معنی کے ساتھ اتنا کثرت سے مستعمل ہے کہ اس کا ترجمہ کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوتی ـــــ قرآن کریم میں اس مادہ (م وت) سے فعل ثلاثی مجرد کے (ماضی، مضارع، امر، نہی کے) مختلف صیغے چالیس کے قریب مقامات پر آئے ہیں۔ اس کے علاوہ مزید فیہ کے باب افعال سے فعل کے صیغے ۲۱ جگہ اور لفظ " موت " اور اس کے مادہ سے دیگر مشتقات سو سے زائد دفعہ وارد ہوئے ہیں۔

[**واللہ**] " وَ " یہاں بلحاظ معنی عاطفہ بھی ہوسکتی ہے اور مستأنفہ بھی۔ اور اسم جلالت (اللہ) پر " بسم اللہ " کے ضمن میں بات ہوچکی ہے [۱:۱:۱ (۲) میں]

۲:۱۴:۱ (۱۱) [**مُحِیْطٌ**] کا مادہ " ح وط " اور وزن اصلی " مُفْعِلٌ " ہے۔ اس کی اصلی شکل " مُحْوِطٌ " تھی۔ جس میں حرف علت " وِ " کی حرکت کسرہ (ـِـ) اس کے ماقبل ساکن حرف صحیح " حْ " کو دے کر اب اس " و " کو اپنے ماقبل کی حرکت (ـِـ) کے موافق حرف علت " ی " میں بدل کر بولا اور لکھا جاتا ہے ـــ اس مادہ سے فعل ثلاثی مجرد " حاط..... یحُوط حَوْطًا " (باب نصر سے اور دراصل حَوَطَ یَحْوُطُ) بطور فعل متعدی مفعول بنفسہ کے ساتھ (بغیر صلہ کے)

استعمال ہوتا ہے یعنی "حاطَهٗ" کہتے ہیں جس کے معنی ہیں :"..... کی حفاظت کرنا، ..... کی دیکھ بھال کرنا" اور یہی فعل (اسی باب سے) "باء (بِ)" کے صلہ کے ساتھ بھی استعمال ہوتا ہے یعنی "حاط بہٖ" بھی کہتے ہیں اور اس وقت اس کے معنی "..... پر آپڑنا، ..... پر اترنا" ہوتے ہیں ــــ تاہم قرآن کریم میں اس مادہ (حوط) سے فعل ثلاثی مجرد کا کوئی صیغہ کہیں بھی استعمال نہیں ہوا۔

● زیرِ مطالعہ کلمہ "مُحِیط" اس مادہ (حوط) سے بابِ افعال کا صیغۂ اسم الفاعل ہے۔ بابِ اِفعال سے فعل "احاط یُحِیط احاطۃً" ہمیشہ "باء (بِ)" کے صلہ کے ساتھ ہی استعمال ہوتا ہے یعنی "اَحَاط بہٖ" کہتے ہیں۔ اس کے معنی "..... کو گھیر لینا، ..... سے پوری طرح باخبر ہونا" ہوتے ہیں۔ کوئی فعل جب لازماً کسی صلہ کے ساتھ استعمال ہوتا ہو تو اس سے بننے والے اسم الفاعل اور اسم المفعول کے ساتھ بھی وہی صلہ لگتا ہے [دیکھئے ۱:۱:۶:۱(۵)] اس لیے یہاں مُحِیطٌ بِ..... آیا ہے۔ گویا یہ "یُحِیطُ بِ....." کے برابر ہے۔ قرآن کریم میں اس مادہ (حوط) سے صرف بابِ افعال کے ہی اَفعال اور اسماء مشتقہ کے مختلف صیغے ۲۷ جگہ آئے ہیں۔

۲:۱۴:۱:۱ (۱۲) [بِالْکَافِرِیْنَ] میں "بِ" تو صلہ کی ہے (یعنی مُحِیط کے ساتھ لگنے والی)۔ اور لفظ "الکافرین" (جو معرّف باللام اور مجرور بالجر ہے) کا مادہ "ک ف ر" اور وزن (لام تعریف نکال کر) "فَاعِلِین" ہے اور یہ لفظ "کافر" کی جمع مذکر سالم ہے۔ اس مادہ سے فعل ثلاثی مجرد کفَر.....یکفُر کفرا (کفر کرنا، ناشکری کرنا وغیرہ) کے معانی اور طریقِ استعمال پر البقرہ: ۶ [۲:۵:۱:۱(۱)] میں بحث ہو چکی ہے۔

● قرآن کریم میں اس فعل کے ثلاثی مجرد سے ہی افعال کے مختلف صیغے ۲۹۰ جگہ آئے ہیں۔ اس کے علاوہ مزید فیہ کے باب تفعیل کے صیغے ۱۴ جگہ اور مختلف اسماء مشتقہ کے صیغے ۲۲۰ کے قریب مقامات پر آئے ہیں۔ اس سے اس مادہ کے

اَفعال اور اسماء کے قرآن کریم میں بکثرت استعمال کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

۲:۱۴:۲ الإعراب

اوكصيب من السماء فيه ظلمت و رعد و برق۔ يجعلون اصابعهم فى اذانهم من الصواعق حذر الموت۔ والله محيط بالكفرين۔

یہ (زیرِ مطالعہ) آیت دراصل تین جملوں پر مشتمل ہے۔ جن کے اعراب کی تفصیل یوں ہے:۔

● [اَوْ] حرفِ عطف ہے اور اس کا تعلق اس سے پہلی آیت (۱۷۔ جس پر ۲:۱۳ میں بات ہوئی ہے) کے ابتدائی لفظ "مَثَلُهم" سے ہے یعنی دراصل عبارت بنتی ہے۔ "اَوْ مَثَلُهم" (یا ان کی مثال)۔ "اَوْ" یہاں شک کے لیے بھی ہو سکتا ہے اور تخییر کے لیے بھی (دیکھیے اوپر حصہ "اللغۃ" میں ۲:۱۴:۱) [كصيّب] کا کاف الجر (كَ) بلحاظ معنی تشبیہ کے لیے ہے۔ گویا "كمثلِ صيّب" ہے۔ اور یہاں "صيّبٍ" سے بھی مراد "اصحابِ صَيّبٍ" (یعنی بارش والے، بارش میں موجود یا مبتلا لوگ) ہیں۔ یعنی تشبیہ بارش سے نہیں بلکہ "بارش والوں کی حالت" سے ہے اور مقدر عبارت "اَوْ مثلهم كمثل اصحاب صيّب" بنتی ہے۔ اس لیے کہ آگے چل کر اسی آیت میں (ان لوگوں کے لیے ہی) جمع مذکر کے الفاظ "يجعلون" اور "هم" وغیرہ آئے ہیں جو "صيّب" نہیں بلکہ "اصحابِ صيّب" کے لیے ہی ہو سکتے ہیں ـــــ بہرحال یہ مرکب (كصيّب) جار مجرور مل کر ایک محذوف (غیر مذکور مگر مفہوم) مبتدأ (مَثَلُهُمْ) کی خبر یا قائم مقام خبر ہے اور یہ (صيّبٍ) نکرہ موصوفہ ہے یعنی اس کی تنوین تنکیر سے "جو کہ" کے معنی پیدا ہوتے ہیں یعنی جو کہ "من السماء" ہے اور یہ [مِنَ السَّماءِ] بھی جارّ (مِنْ) اور مجرور (السماءِ) مل کر "صَيّب" کی صفت ہونے کے لحاظ سے محلاً مجرور

ہے۔اس کا " مِنْ " ابتداءالغایۃ کے لیے بھی ہو سکتا ہے (کہ بارش کس طرف سے آرہی ہے) اور مِنْ بیانیہ بھی کہہ سکتے ہیں (یعنی پانی کی اس بوچھاڑ کی وضاحت ہے کہ وہ اوپر۔آسمان سے آرہی ہے) ۔[فیہ] جار (فی) اور مجرور (ہ) مل کر خبر مقدم ہے جس میں ھاء الضمیر (ہ) کا مرجع " صیّب " ہے۔اور [ظلمات] مبتدأ مؤخر نکرہ ہے اور [وَرَعْدٌ] اور [وَبَرْقٌ] ہر دو بھی واو عاطفہ کے ذریعے " ظلمات " پر معطوف ہیں۔یعنی یہ تینوں کلمات (ظلماتٌ و رعدٌ و برقٌ) مبتدأ مؤخر کا کام دے رہے ہیں۔اس طرح " فیہ ظلمات ورعد وبرق " کا ترجمہ ہوگا " اس میں ہے ظلمات اور رعد اور برق " (یعنی اندھیرے اور گرج اور چمک) اور یہ پورا جملہ بھی " صَیِّبٌ " کی صفت ہے۔اس طرح مندرجہ بالا ترکیب کے مطابق یہاں تک کے حصۂ آیت (او کصیّبٍ ..... وبرق) کا ترجمہ کچھ یوں بنتا ہے " یا (ان کی مثال) ایسی صیّب (بارش) (میں پھنسے لوگوں) کی مانند ہے جو کہ من السماء (آسمان سے آرہی) ہے جس میں ظلمات ورعد وبرق (اندھیرے گرج اور بجلی کی چمک) ہو"۔

● [یَجْعَلُون] فعل مضارع معروف صیغہ جمع مذکر غائب ہے جس میں ضمیر فاعلین " ھم " مستتر ہے اور یہاں (یجعلون) سے شروع ہونے والا جملہ " اصحاب صیّب (بارش والوں) " کا بیان یا صفت یا حال بھی ہو سکتا ہے۔اور الگ مستقل جملہ (مستأنفہ) بھی ہو سکتا ہے۔[اَصَابِعَھُم] یہ مضاف (اصابع) اور مضاف الیہ (ھم) مل کر پورا مرکب اضافی فعل " یجعلون " کا مفعول بہ ہے (یعنی اپنی انگلیوں کو)۔اسی لیے " اصابع " یہاں منصوب ہے اور اس کی نصب کی علامت " ع " کا فتحہ (ـَـ) ہے۔[فی آذانھم] میں " فِی " تو حرف الجر ہے اور " آذانِ " اس کی وجہ سے مجرور ہے جس کی علامتِ جر " ن " کا کسرہ (ـِـ) ہے اور یہ (آذان) آگے مضاف بھی ہے اس لیے خفیف (لام تعریف اور تنوین کے بغیر) ہے۔آخری " ھُمْ " ضمیر مجرور مضاف الیہ ہے جس کی " ھا "

ماقبل کے مکسور ہونے کی وجہ سے مکسور (ھِمْ) ہوگئی ہے۔ اور یہ سارا مرکب جارّی (فِی آذانِھِم) متعلق فعل "یجعلون" ہے۔ یا اسے اس فعل (یجعلون) کے دوسرے مفعول کا قائم مقام سمجھ کر محلاً منصوب بھی کہہ سکتے ہیں۔ [مِنَ الصواعق] یہ جار (مِن) اور مجرور (الصواعق) مل کر (جو دراصل تو "من صوتِ الصواعق" کا مفہوم رکھتا ہے یعنی "صواعق" کی آواز کی وجہ سے) فعل "یجعلون" سے متعلق ہے اور اس کے مفعول لہٗ کا کام دے رہا ہے گویا محلاً منصوب ہے یعنی "صواعق (بجلیوں کی کڑک والی آواز) سے (بچنے کے لیے) ایسا کرتے ہیں"۔

— اور [حَذَرَ الموتِ] مرکب اضافی ہے جس میں (مضاف) لفظ "حذر" مفعول لہٗ ثانی ہے اسی لیے منصوب ہے جس کی علامتِ نصب "ر" کی فتحہ (ـَ) ہے اور یہ مضاف ہونے کی وجہ سے "حَذَرًا" کا "حَذَرَ" رہ گیا ہے۔ اور "الموت" اس (حذر) کا مضاف الیہ مجرور ہے۔ اس طرح اس (حذرَ الموتِ) کا ترجمہ ہوگا "موت کے ڈر یا اندیشے سے، یا موت سے بچنے کے لیے" اور یہ دوسرا مفعول لہٗ پہلے مفعول لہٗ (من الصواعق) کے ساتھ مقیّد ہے۔ یعنی دونوں کو ملا کر ترجمہ ہوگا "بجلیوں کی (کڑک) کی وجہ سے موت (کے اندیشے) سے (بچنے کے لیے)۔ اسی کا نسبتاً بامحاورہ ترجمہ "کڑک کے سبب موت کے ڈر سے" یا "کڑک کے سبب موت کے اندیشہ سے" کیا گیا ہے۔ یعنی بیشتر مترجمین نے یہاں "مِنْ" کا ترجمہ "مِنْ تعلیلیہ" کے ساتھ کیا ہے۔ [دیکھیے مِنْ کے معانی ۲:۲:۱(۵) میں]

● [وَاللّٰہُ] کی "واو" اعتراضیہ ہے یعنی جملۂ معترضہ کے شروع میں آئی ہے اور اسے "واو الاستیناف" بھی کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ یہاں سے ایک نیا جملہ (معترضہ) شروع ہوتا ہے جس کا اپنے سے پہلے جملے پر بلحاظ معنی عطف نہیں بنتا۔ اردو میں یہ فرق محض ترجمہ سے ظاہر نہیں کیا جاسکتا۔ اس کا اردو ترجمہ تو "اور" سے ہی کیا جاسکتا ہے مگر دراصل اس میں "اور پھر یہ بھی تو ہے کہ" کا مفہوم موجود ہے۔ اور اگر چاہیں تو

اس "واو" کو حالیہ قرار دے کر اس کا ترجمہ "حالانکہ" سے بھی کیا جاسکتا ہے اور بعض مترجمین نے ایسا ہی کیا ہے۔ اور "[اللّٰہُ]" یہاں مبتدأ (لھذا) مرفوع ہے اور اس کی خبر [محیطٌ] ہے جو اسی لیے مرفوع ہے۔ اور [بالکافرین] جارّ (ب) اور مجرور (الکافرین) مل کر متعلق خبر (محیط) ہے۔ اس طرح یہ جملہ اسمیہ (واللہ محیط بالکافرین) ایک جملہ معترضہ ہے۔ کیونکہ اس سے پہلے جس بجلی اور اس کی چمک کا ذکر ہوا ہے وہ اس سے اگلی (آنے والی) آیت میں بھی چل رہا ہے۔ اور درمیان میں یہ "واللہ محیط بالکافرین" ایک جملہ معترضہ کے طور پر آیا ہے یعنی ایک مسلسل مضمون کے درمیان آنے والا ضمنی جملہ جس میں کسی دوسرے مضمون کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے ـــــ مبتدأ خبر ہونے کی بنا پر اور اس لیے کہ "محیط" اسم الفاعل کا صیغہ ہے، جملہ "واللہ محیط بالکافرین" کا بنیادی لفظی ترجمہ تو ہونا چاہیئے "اور اللہ گھیر لینے والا ہے کافروں کو"۔ اس میں "کو" عربی "ب" کا ترجمہ ہے جو دراصل فعل "احاط" کا "صلہ" ہے۔ تاہم محاورہ اور مفہوم کو ذہن میں رکھتے ہوئے بیشتر مترجمین نے "محیط" کا ترجمہ "گھیرے میں لیے ہوئے ہے" یعنی "یُحِیْط" کی طرح کر دیا ہے۔

۲:۱۴:۳ الرسم

زیر مطالعہ آیت میں کل ۲۱ کلمات ہیں ان میں سے بیشتر کلمات کا رسم عثمانی اور رسم املائی یکساں ہے۔ صرف چار کلمات بلحاظ رسم عثمانی تفصیل طلب ہیں اور یہ ہیں "ظلمات، اصابعھم، "الصواعق" اور "الکافرین" (اور یہ ان کی رسم املائی ہے) ان کے رسم عثمانی کی تفصیل یوں ہے۔

● [ظُلُمٰتٌ] جو عام رسم معتاد میں "ظلمات" باثبات الالف بعد المیم لکھا جاتا ہے، رسم عثمانی کے مطابق یہ لفظ قرآن کریم میں ہر جگہ بحذف الالف بعد المیم یعنی "ظلمت" لکھا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں یہ کلمہ معرفہ یا نکرہ کل ۳۳ بار آیا ہے۔

اور ہر جگہ اس کا رسم قرآنی بحذف الف یعنی " ظلمت " ہے [نیز دیکھیے سابقہ آیت البقرہ : ۱۷ یعنی ۲ : ۱۳ : ۳]

● [اصابعھم] رسم املائی میں تو اسی طرح باثبات الف (بین الصاد والباء) لکھا جاتا ہے تاہم اس کا رسم عثمانی مختلف فیہ ہے۔ تمام عرب اور افریقی ملکوں (ماسوائے لیبیا کے) کے مصاحف میں اسے محذوف الالف (بعد الصاد) یعنی بصورت " اَصْبَعَھُمْ " لکھا جاتا ہے اور یہ حذف الالف ابو داؤد سلیمان بن نجاح (المتوفی ۴۹۶ھ) کی طرف منسوب قول پر مبنی ہے۔ جب کہ لیبیا والے مختلف فیہ رسم میں ابو داؤد کے استاد عثمان بن سعید الدانی (المتوفی ۴۴۴ھ) کو حجت مانتے ہیں اور الدانی نے (بلکہ اس کے بعد کے مصنف الشاطبی المتوفی ۵۹۰ھ نے بھی) اس کلمہ کے محذوف الالف ہونے کا کہیں ذکر نہیں کیا۔ اس وجہ سے لیبیا میں اسے " اصابعھم " باثبات الالف ہی لکھا گیا ہے۔ برصغیر میں صحت کے اہتمام کے ساتھ چھپنے والے مصاحف (مثلاً انجمن حمایت اسلام، لاہور یا بمبئی کے بعض مصاحف) میں بھی اسے باثبات الالف ہی لکھا گیا ہے اور اسے بکسر غلط رسم ہرگز نہیں کہا جا سکتا۔ جیسا کہ مدینہ یونیورسٹی کے دو اساتذہ نے برصغیر کے مصاحف کی اغلاط الرسم کے بارے میں اپنی ایک رپورٹ میں کہا ہے۔ پاکستان میں صرف " تجوید قرآن " کے اندر " مصحف حکومت مصر " کے اتباع میں یہ کلمہ بحذف الف لکھا گیا ہے۔

● [الصواعق] جو عام رسم املائی میں اسی طرح باثبات الالف (بعد الواو) لکھا جاتا ہے۔ اس کے رسم عثمانی کے بارے میں بھی مذکورہ بالا کلمہ (اصابعھم) والا اختلاف ہے یعنی عرب اور افریقی ملکوں کے مصاحف میں ابو داؤد کے قول کی بناء پر اسے محذوف الالف کر کے یعنی بصورت " الصوعق " لکھتے ہیں۔ جب کہ لیبی مصاحف میں الدانی کی عدم صراحت کی بنا پر اسے باثبات الالف (الصواعق) لکھا جاتا ہے۔ خیال رہے کہ ان تمام کلمات میں، جو عام عربی املاء میں باثبات الف لکھے جاتے ہیں ان کے رسم عثمانی میں بحذف الف لکھا جانا صرف اس صورت میں ضروری ہوتا ہے جب ائمہ رسم نے اس کے حذف کی تصریح کی ہو۔ اور جہاں حذف

کی تصریح نہیں تو اسے اثبات (الف) پر ہی محمول کیا جاتا ہے۔ یہ کلمہ (الصواعق) برصغیر کے مصاحف میں بھی اسی طرح باثباتِ الف ہی لکھا جاتا ہے تاہم یہاں اثبات الف کی وجہ وہ نہیں جو لیبیا والے بیان کرتے ہیں بلکہ شاید سہواً ہی ۔ یا پھر ایران اور ترکی کے مصاحف کے اتّباع میں ایسا لکھا گیا۔ تاہم اسے یکسر غلط رسم ہرگز نہیں کہا جا سکتا۔ جیساکہ مدینہ یونیورسٹی کے دو سعودی اساتذہ نے اپنی "رپورٹ" میں کہا ہے ۔

[الکٰفرین] یہ لفظ عام عربی املاء میں تو باثبات الالف بعد الکاف لکھا جاتا ہے یعنی بصورت " الکافرین "۔ تاہم اس کا عثمانی رسم ہر جگہ بحذف الف ہے یعنی" الکفرین" اور یہ تمام ائمہ رسم کے مطابق متفق علیہ رسم ہے۔ برصغیر میں بھی اسے عموماً بحذف الف ہی لکھا جاتا ہے جیساکہ لاہور، بمبئی اور دہلی کے مطبوعہ مصاحف میں دیکھا جا سکتا ہے۔

ترکی ، ایران اور چین کے مصاحف میں مذکورہ بالا چاروں کلمات باثبات الف لکھنے کا رواج ہوگیا ہے جو " ظلمات " اور " الکافرین " کے معاملے میں تو متفقہ رسم عثمانی کی صریح مخالفت اور لہٰذا سخت غلطی ہے یہ " ظلمت " اور " الکٰفرین " ہی لکھے جانے چاہئیں ۔ البتّہ " اصابعھم " اور " الصواعق " کی صورت میں رسم کے مختلف فیہ ہونے کی بنا پر اسے یکسر غلط قرار نہیں دیا جا سکتا۔ تاہم ایرانی یا ترک کاتبوں کے سامنے (لیبیا والوں کی طرح) ابوداؤد اور الدانی کا اختلاف نہیں تھا۔ بلکہ غالباً ان ملکوں میں رسم املائی کے اتباع کے باعث یہ " غلطی " عام ہوگئی جسے محض اتفاقاً فنی اعتبار سے غلطی نہیں کہا جاسکتا۔ اس قسم کے اختلافِ رسم کے کئی نمونے آگے چل کر بھی ہمارے سامنے آئیں گے ۔

۲:۱۴:۴ الضبط

زیرِ مطالعہ آیت کے کلمات کے متفق یا مختلف ضبط کو درج ذیل نمونوں سے سمجھا جا سکتا ہے:۔

○ اَوْ ، اَوْ ، اَوْ / كَصَيِّبٍ ، كَصَيِّبٍ ، كَصَيِّبٍ ۔

مِنَ ، مِنَ / السَّمَآءِ ، السَّمَاءِ ، اَلسَّمَآءِ ، اَلسَّمَآءِ ۔

فِيهِ ، فِيهِ ، فِيهِ ، فِيهِ ۔

ظُلُمٰتٌ ، ظُلُمٰتٌ ، ظُلُمٰتٌ ۔

وَرَعْدٌ ، وَرَعْدٌ ، وَرَعْدٌ ۔

وَّبَرْقٌ ، وَبَرْقٌ ، وَبَرْقٌ ۔

يَجْعَلُوْنَ ، يَجْعَلُوْنَ ، يَجْعَلُوْنَ ، يَجْعَلُوْنَ ۔

اَصَابِعَهُمْ ، اَصَابِعَهُمْ ، اَصَابِعَهُمْ ،

اَصَابِعَهُمْ / فِيْ ، فِيْ ، فِيْ ، فِيْ ۔

اٰذَانِهِمْ ، اٰذَانِهِمْ ، اٰذَانِهِمْ ، اٰذَانِهِمْ

اٰذَانِهِمْ / مِنَ ، مِنَ ۔

الصَّوَاعِقِ ، الصَّوَاعِقِ ، اَلصَّوَاعِقِ ، اَلصَّوَاعِقِ ۔

حَذَرَ ، حَذَرَ / الْمَوْتِ ، اَلْمَوْتِ ، اَلْمَوْتِ ۔

وَاللّٰهُ ، وَاللّٰهُ ، وَاللّٰهُ ، وَاللّٰهُ ، وَاللّٰهُ ۔

مُحِيْطٌ ، مُحِيْطٌ ، مُحِيْطٌ ، مُحِيْطٌ / بِالْكٰفِرِيْنَ ،

بِالْكٰفِرِيْنَ ، بِالْكٰفِرِيْنَ ، بِالْكٰفِرِيْنَ ، بِالْكٰفِرِيْنَ ۔

الرّحیق المختوم

تالیف : مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوری

ناشر: مکتبہ سلفیہ شیش محل روڈ لاہور۔

آج اگر آپ یہ سوال کریں کہ وہ کونسی شخصیت ہے جس کی ذات، شخصیت، سیرت، کردار اور تعلیمات کے حوالے سے سب سے زیادہ کتابیں لکھی گئیں، شائع ہوئیں۔ تو بغیر کسی جذبۂ عقیدت، محض حقائق کی بنیاد پر جواب ہوگا کہ :

محمد —— خاتم النبیین والمعصومین صلّی اللہ تعالیٰ علیہ و علیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم!

دنیا کا ہر شخص، کسی بھی مذہب، زبان اور خطے سے تعلّق رکھنے والا —— بشرطیکہ کسی تعصّب کا شکار نہیں، اس جواب کو تسلیم کرے گا اور مانے گا کہ بات ایسے ہی ہے —— پھر لکھنے والوں میں صرف وہ ہی نہیں جو انہیں اللہ تعالےٰ کا رسول، نبی —— اور آخری پیغمبر مانتے ہیں بلکہ وہ بھی ہیں جو ایسا نہیں مانتے، اسی طرح ایک زبان کا سوال نہیں، ہر زبان میں ضخیم اور مختصر کتابیں آپ کو ملیں گی —— ہر لکھنے والا لکھ کر اور پوری ہمّت صرف کرکے یہ کہنے پر مجبور ہوگا۔

دفتر تمام گشت بپایاں رسید عمر ما ہم چناں در وصف اوّل تو ماندہ ایم

آج کی بزم میں —— انسانیت کے اُس دولہا پر تالیف شدہ ایک ایسی کتاب کا تعارف مقصود ہے جو عربی میں لکھی گئی اور جناب مؤلّف نے خود ہی پھر اس کو اُردو کا جامہ پہنایا —— جناب مؤلف —— ضلع اعظم گڑھ کے مردم خیز ضلع میں پیدا ہوئے "مبارک پور" بجائے خود ایسا قصبہ ہے جو سراپا برکت ہے کہ بہت سے اہلِ علم و دانش نے اسے رونق بخشی اور ان کے علم کی خوشبو چاروں طرف پھیلی —— جناب مؤلّف چونکہ سلفی برادری سے تعلّق رکھتے ہیں اس لیے سلفیہ کے معیاری مدارس کے علاوہ الٰہ آباد بورڈ کے امتحانات بھی امتیازی حیثیت سے پاس کیے۔ اس کے بعد کسی دوسرے مشغلہ میں لمحہ بھر ضائع کیے بغیر تدریس تالیف اور تصنیف میں لگ گئے —— اُن کے قلم سے ۲۱ کتابیں زیرِ تبصرہ کتاب کے علاوہ

نکل چکی ہیں ـــ عربی اور اردو زبانوں میں ـــ جبکہ ایک وقیع رسالہ "محدث" بنارس کی ۱۲ سالہ ادارت بھی ان کے سپرد رہی ـــ مارچ ۱۹۷۶ء میں کراچی کی سیرت کانفرنس میں رابطہ عالم اسلامی نے دنیا بھر کے اہلِ علم کو سیرت کے موضوع پر لکھنے کی دعوت دی، پانچ انعامات کا اعلان ہوا ـــ صفی صاحب کو ان کے ایک محترم استاذ نے بار بار ترغیب دی کہ اس پر قلم اٹھاؤ ـــ یہ گھبرائے کہ موضوع نازک ہے اور ذمہ داری بہت زیادہ ـــ محترم استاذ کے ساتھ کہنے سننے والے اور بھی بہت تھے۔ آخر توفیقِ الٰہی سے قلم اٹھایا اور عربی میں وقیع مقالہ تیار ہو گیا۔

رابطہ کو ابتدا میں ۱۸۲ مقالات موصول ہوئے جو بجائے خود پیغمبرِ اسلام کا زندہ معجزہ تھے۔ ان میں سے ۱۸۳ مقالات چھانٹے گئے اور پہلے انعام کا "الرحیق المختوم" کو مستحق قرار دیا گیا ـــ جبکہ دوسرا انعام جامعہ ملیہ دہلی کے استاذ ڈاکٹر ماجد کی انگریزی کتاب اور تیسرا انعام بہاولپور یونیورسٹی کے ڈاکٹر نصیر کی اردو کتاب کو ملا۔ چوتھا اور پانچواں انعام مصر و سعودیہ کے اسکالروں کو نصیب ہوا۔ یہ بات جہاں برعظیم پاک و ہند کے لیے بہ حیثیت مجموعی باعثِ سعادت تھی کہ ابتدائی ۳ انعام یہاں کے سکالروں کو ملے وہاں مولانا صفی الرحمٰن سب سے زیادہ مستحق تبریک تھے کہ پہلا انعام انہیں ملا ـــ عربی تصنیف پر!

مولانا موصوف نے ایک تو اس بات کا اہتمام کیا کہ ٹھوس اور بنیادی منابع و مصادر سے باہر قدم نہیں رکھا اور جو بات لکھی ٹھوک بجا کر پوری صحت و ذمہ داری کے ساتھ لکھی ـــ چونکہ موصوف علمی خانوادہ سے متعلق ہیں اور علم و تعلیم کے بغیر ان کا کوئی شغل نہیں اس لیے کتاب کی سطر سطر ان کی علمی بصیرت کا پتہ دیتی ہے اور صاف نظر آتا ہے کہ کوئی محدث، اور صاحبِ نظر عالم ہے جس کا قلم رواں دواں ہے ـــ اردو ترجمہ موصوف نے خود ہی کیا ہے اور یہ اپنی جگہ بڑی خوبی کی بات ہے۔

ہمارے دوست الحافظ احمد شاکر فرزندِ عزیز مولانا عطاء اللہ حنیف رحمہ اللہ تعالیٰ نے اردو ترجمہ اپنے یہاں سے چھاپا ـــ ۴ ایڈیشن نکل گئے پانچواں جا رہا ہے، کتابت، طباعت، کاغذ اور تجلید میں موصوف کا جو ذوق ہے اس سے ہر وہ شخص واقف ہے جس نے ان کے ادارہ کی کوئی بھی کتاب دیکھی ہے ـــ بہر حال اس خوب صورت اور پاکیزہ کتاب نے خود ہم پر سیرت کے بہت سے نئے گوشے بے نقاب کیے۔

(محمد سعید الرحمٰن علوی)

تین طلاق یا ایک ؟

مولانا محمد تقی امینی کی خدمت میں جناب کفایت بخاری کی معروضات

مکرم و محترم مدیر ماہنامہ حکمت قرآن۔ السلام علیکم۔

اللہ کرے مزاج گرامی مع الخیر ہوں۔ میں میثاق اور حکمت قرآن کا باقاعدہ قاری ہوں۔ تاہم ہمارے ہاں (ساجد نیوز ایجنسی۔ حضرو) رسالہ عموماً دیر سے پہنچتا ہے۔ اس دفعہ حکمت قرآن تین چار دن قبل وصول ہوا۔ لیکن اسے پڑھنے کا موقع آج ملا۔ اس قدر معیاری علمی و تحقیقی جریدہ نکالنا اور موجودہ حالات میں اسے جاری رکھنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔

اس دفعہ جناب کی باصرہ خراشی کی جرأت رسالہ ہذا کے ص۵ پر درج ایک عبارت سے ہوئی جو درج ذیل ہے:

> "ایک ہی وقت میں تین طلاقیں دینے کا طریقہ نہایت غلط ہے۔ اس پر پابندی لگانے کی ضرورت ہے یا کم از کم اتنا تو ہونا ہی چاہیئے کہ ایک مجلس کی تین طلاق کو ایک شمار کیا جائے تاکہ اس کے ساتھ دوسری مرتبہ نکاح کرنے میں دشواری نہ ہو جیسا کہ علامہ ابن تیمیہؒ وغیرہ کی رائے ہے۔"
>
> (حکمت قرآن ص۵ شمارہ ستمبر ۹۰ء)

یہ ایک علمی بحث ہے لیکن جس انداز سے اسے مولانا امینی صاحب نے پیش فرمایا ہے اس سے کئی غلط فہمیاں پیدا ہو سکتی ہیں لہٰذا چند سطور لکھنے کی جسارت کر رہا ہوں —— نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مجلس کی تین طلاق کو تین ہی تسلیم فرمایا ہے۔ ملاحظہ ہو:

روایت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ	دارقطنی ۲/۴۳۳
روایت امام حسن رضی اللہ عنہ	دارقطنی ۲/۴۳۷ ، سنن کبریٰ ۷/۳۳۶
واقعہ عویمر رضی اللہ عنہ	بخاری ۲/۷۹۱ ، مسلم ۱/۴۸۹ نسائی ۲/۸۳

کچھ آثار صحابہ رض ملاحظہ ہوں :

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا یہی مسلک ہے — عبدالرزاق
حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہی فتویٰ ہے — سنن کبریٰ
حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا یہی مذہب ہے۔ سنن کبریٰ طحاوی، دارقطنی، موطا امام مالک، مسند شافعی
حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا یہی مسلک ہے — بخاری، مسلم، سنن کبریٰ، دارقطنی۔
حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا یہی مسلک ہے — مؤطا امام مالک، طحاوی۔

امام نووی رح فرماتے ہیں کہ جس شخص نے اپنی بیوی کو کہا کہ میں نے تجھے تین طلاق دی تو امام شافعی، امام مالک، امام ابو حنیفہ، امام احمد اور جمہور سلف و خلف کا یہ مذہب ہے کہ تین طلاقیں واقع ہوں گی۔ (نووی شرح مسلم)

بلکہ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رح کے دادا امام ابوالبرکات ابن تیمیہ رح ایک کلمہ سے دی گئی تین طلاقوں کے واقع ہونے پر اجماع نقل کرتے ہیں۔ (منتقی الاخبار)

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رح اسی امت کے جبالِ علم میں سے تھے۔ اُن کی جلالتِ شان اور رفعت منزلت مسلّم ہے لیکن اس مسئلہ میں ان سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔ سلفی مکتبِ فکر کی اکثریت کا موجودہ مسلک وہی ہے جو مولانا محترم کی مندرجہ بالا عبارت سے سامنے آتا ہے۔ لیکن دلائل کی دنیا میں اس کا مقام متعین کرنا چنداں مشکل نہیں۔

اپنے مشورہ کی جو علّت مولانا محترم نے بیان فرمائی کہ اُس کے ساتھ دوسری مرتبہ نکاح کرنے میں دشواری نہ ہو، اسی کے پیشِ نظر کیا ثلٰثۃ قروء میں دی گئی تین طلاقوں کے متعلق بھی یہی مشورہ دیا جا سکتا ہے؟ کیونکہ یہ دشواری تو وہاں بھی موجود ہے!

والسّلام مع الاکرام
کفایت بخاری
کامرہ کلاں (اٹک)

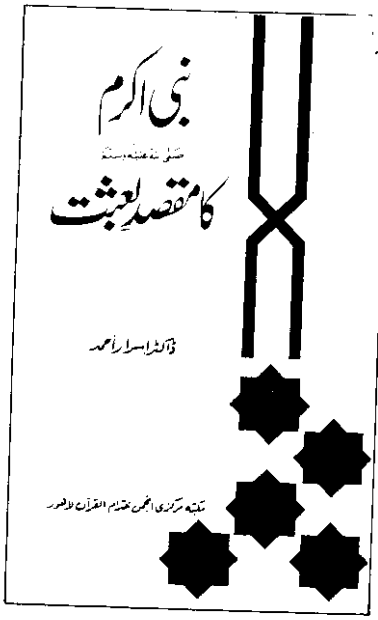

اشاعتِ خاص -/۲۰ روپے، عام -/۶ روپے

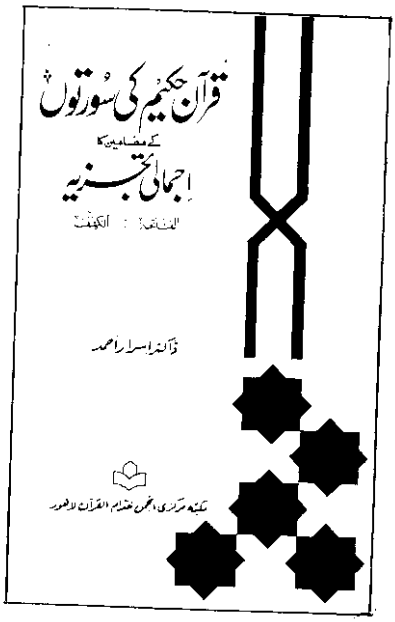

اشاعتِ خاص -/۴۰ روپے، عام -/۲۰ روپے

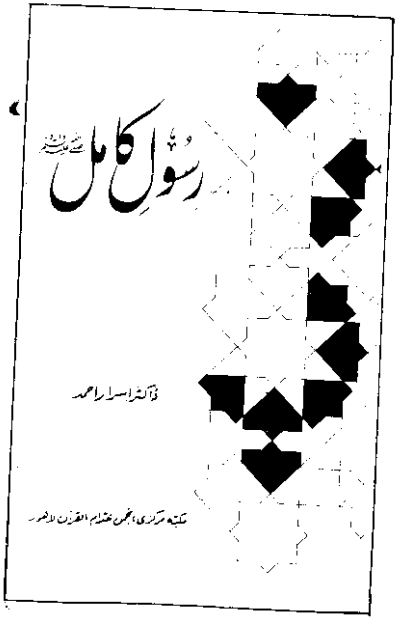

اشاعتِ خاص -/۱۲ روپے، عام -/۵ روپے

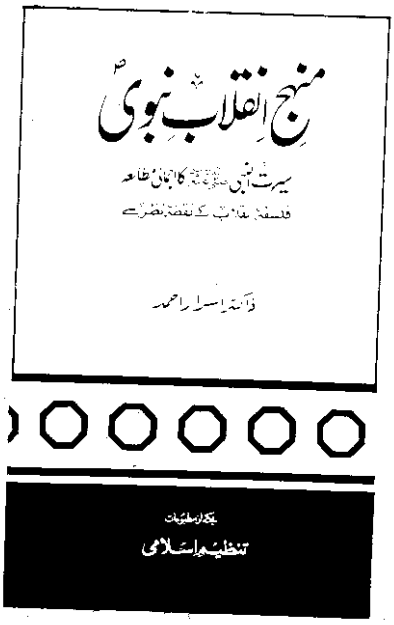

اشاعتِ خاص -/۶۰ روپے، عام -/۳۰ روپے

DECEMBER Regd No. L. No. 8193

MONTHLY
HIKMAT_E_QURAN
LAHORE

VOL. 9
NO. 12

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

کے قیام کا مقصد

منبعِ ایمان ـــــ اور ـــــ سرچشمۂ یقین

قرآنِ حکیم

کے علم و حکمت کی

وسیع پیمانے ـــــ اور ـــــ اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ اُمتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں تجدیدِ ایمان کی ایک عمومی تحریک برپا ہو جائے

اور اس طرح

اسلام کی نشاۃِ ثانیہ ـــ اور ـــ غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ

DECEMBER Regd No. L. No. 8193

MONTHLY
HIKMAT_E_QURAN
LAHORE

VOL. 9
NO. 12

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

کے قیام کا مقصد

منبعِ ایمان ـــــ اور ـــــ سرچشمۂ یقین

قرآنِ حکیم

کے علم و حکمت کی

وسیع پیمانے ـــــ اور ـــــ اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ اُمتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں تجدیدِ ایمان کی ایک عمومی تحریک برپا ہو جائے

اور اس طرح

اسلام کی نشاۃِ ثانیہ ـــ اور ـــ غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ